کورس: پاکستانی زبانیں اور ادب۔I (4657)

سمسٹر: خزاں 2019ء

امتحانی مشق نمبر 1

(یونٹ: 1 تا 4)

سوال نمبر 1- برصغیر میں اردو زبان کی ابتداء کس طرح سے ہوئی؟ اور وہ کون سے عوامل ہیں جنہوں نے اردو زبان کو پھیلانے میں مدد کی؟ تفصیل سے لکھیں۔ (20)

سوال نمبر 2- سرسید احمد خان کی ادبی تحریک کیا تھی؟ اس تحریک کے سیاسی مقاصد کیا تھے؟ تفصیلی جواب تحریر کریں۔ (20)

سوال نمبر 3- علامہ اقبال کی شخصیت کو ان کے افکار و شاعری کی روشنی میں واضح کریں؟ (20)

سوال نمبر 4- پاکستان میں اردو افسانے کے ارتقائی سفر کا احوال قلم بند کریں؟ (20)

سوال نمبر 5- ''اپنے جداگانہ افکار اور شاعری کی وجہ سے فیض احمد فیض کو اردو شاعری میں ایک الگ مقام حاصل ہے''۔

افکار اور اشعار کی روشنی میں ثابت کریں۔ (20)

Q.NO.01

اُردو برصغیر کی زبانِ رابطۂ عامہ ہے۔ اس کا اُبھار 11 ویں صدی عیسوی کے لگ بھگ شروع ہو چکا تھا۔ اُردو ، ہند-یورپی لسانی خاندان کے ہند-ایرانی شاخ کی ایک ہند-آریائی زبان ہے۔ اِس کا اِرتقاء جنوبی ایشیاء میں سلطنتِ دہلی کے عہد میں ہوا اور مغلیہ سلطنت کے دوران فارسی، عربی اور ترکی کے اثر سے اس کی ترقّی ہوئی۔

اُردو (بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے) دُنیا کی تمام زبانوں میں بیسویں نمبر پر ہے۔ یہ پاکستان کی قومی زبان جبکہ بھارت کی 23 سرکاری زبانوں میں سے ایک ہے.

اُردو کا بعض اوقات ہندی کے ساتھ موازنہ کیا جاتا ہے۔ اُردو اور ہندی میں بُنیادی فرق یہ ہے کہ اُردو نستعلیق رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور عربی و فارسی الفاظ استعمال کرتی ہے۔ جبکہ ہندی دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور سنسکرت الفاظ زیادہ استعمال کرتی ہے

کچھ ماہرینِ لسانیات اُردو اور ہندی کو ایک ہی زبان کی دو معیاری صورتیں گردانتے ہیں۔ تاہم، دوسرے اِن کو معاش اللسانی تفرّقات کی بنیاد پر الگ سمجھتے ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہندی ، اُردو سے نکلی۔اسی طرح اگر اردواور ھندی زبان کو ایک سمجھا جائے تو یہ دنیا کی چوتھی بڑی زبان ہے

تاریخ

اردو کو سب سے پہلے مغل شہنشاہ اکبر کے زمانے میں متعارف کروایا گیا۔واقعہ کچھ یوں ہے کہ برِصغیرمیں 635 ریاستیں تھیں جن پر اکبر نے قبضہ کر لیا۔اتنے بڑے رقبے کی حفاظت کے لیے اسے مضبوط فوج کی ضرورت تھی۔اس لیے اس نے فوج میں نئے سپاہی داخل کرنے کا حکم دیا۔ان 635 ریاستوں سے کئی نوجوان امڈ آئے۔سب کے سب الگ الگ زبان کے بولنے والے تھے جس سے فوجی انتظامیہ کو مشکلات کا سامنا تھا۔اکبر نے نیا حکم جاری کیا کہ سب میں ایک نئی زبان متعارف کروائی جائے۔تب سب فوجیوں کو اردو کی تعلیم دی گئی جن سے آگے اردو برِصغیرمیں پھیلتی چلی گئی۔

اردو ترکی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے لشکر۔دراصل مغلوں کے دور میں کئی علاقوں کی فوجی آپس میں اپنی زبانوں میں گفتگو کیا کرتے تھے جن میں ترکی،عربی اور فارسی زبانیں شامل تھیں۔چونکہ یہ زبانوں کا مجموعہ ہے اس لیے اسے لشکری زبان بھی کہا جاتا ہے۔دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ کر زبان کے الفاظ اپنے اندر سمو لینے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے۔

بولنے والے اور جُغرافیائی پھیلاؤ

معیاری اُردو (کھڑی بولی) کے اصل بولنے والے افراد کی تعداد 60 سے 80 ملین ہے۔ ایس.آئی.ایل نژادیہ کے 1999ء کی شماریات کے مطابق اُردو اور ہندی دُنیا میں پانچویں سب سے زیادہ بولی جانی والی زبان ہے۔ لینگویج ٹوڈے میں جارج ویبر کے مقالے: 'دُنیا کی دس بڑی زبانیں' میں چینی زبانوں، انگریزی اور ہسپانوی زبان کے بعد اُردو اور ہندی دُنیا میں سب سے زیادہ بولے جانی والی چوتھی زبان ہے۔ اِسے دُنیا کی کُل آبادی کا 4.7 فیصد افراد بولتے ہیں۔

اُردو کی ہندی کے ساتھ یکسانیت کی وجہ سے، دونوں زبانوں کے بولنے والے ایک دوسرے کو عموماً سمجھ سکتے ہیں۔ درحقیقت، ماہرینِ لسانیات اِن دونوں زبانوں کو ایک ہی زبان کے حصّے سمجھتے ہیں۔ تاہم، یہ معاشی و سیاسی لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں. لوگ جو اپنے آپ کو اُردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں وہ ہندی کو اپنی مادری زبان تسلیم نہیں کرتے، اور اِسی طرح اِس کے برعکس۔

پاکستان میں اردو

اُردو کو پاکستان کے تمام صوبوں میں سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ مدرسوں میں اعلٰی ثانوی جماعتوں تک لازمی مضمون کی طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ اِس نے کروڑوں اُردو بولنے والے پیدا کردیئے ہیں جن کی زبان پنجابی، پشتو، سندھی، بلوچی، کشمیری، براہوی، چترالی وغیرہ میں

سے کوئی ایک ہوتی ہے. اُردو پاکستان کی مُشترکہ زبان ہے اور یہ علاقائی زبانوں سے کئی الفاظ ضم کررہی ہے۔ اُردو کا یہ لہجہ اب پاکستانی اُردو کہلاتی ہے. یہ اَمر زبان کے بارے میں رائے تبدیل کررہی ہے جیسے اُردو بولنے والا وہ ہے جو اُردو بولتا ہے گو کہ اُس کی مادری زبان کوئی اَور زبان ہی کیوں نہ ہو. علاقائی زبانیں بھی اُردو کے الفاظ سے اثر پارہی ہیں. پاکستان میں کروڑوں افراد ایسے ہیں جن کی مادری زبان کوئی اَور ہے لیکن وہ اُردو کو بولتے اور سمجھ سکتے ہیں۔ پانچ ملین افغان مہاجرین، جنھوں نے پاکستان میں پچیس برس گزارے، میں سے زیادہ تر اُردو روانی سے بول سکتے ہیں۔ وہ تمام اُردو بولنے والے کہلائیں گے۔ پاکستان میں اُردو اخباروں کی ایک بڑی تعداد چھپتی ہے جن میں روزنامۂ جنگ، نوائے وقت اور ملّت شامل ہیں۔

بھارت میں اردو

بھارت میں، اُردو اُن جگہوں میں بولی اور استعمال کی جاتی ہے جہاں مسلمان اقلیتی آباد ہیں یا وہ شہر جو ماضی میں مسلمان حاکمین کے مرکز رہے ہیں۔ اِن میں اُتر پردیش کے حصے (خصوصاً لکھنؤ)، دہلی، بھوپال، حیدرآباد، بنگلور، کولکتہ، میسور، پٹنہ، اجمیر اور احمد آباد شامل ہیں. کچھ بھارتی مدرسے اُردو کو پہلی زبان کے طور پر پڑھاتے ہیں، اُن کا اپنا خاکۂ نصاب اور طریقۂ امتحانات ہیں۔ بھارتی دینی مدرسے عربی اور اُردو میں تعلیم دیتے ہیں۔ بھارت میں اُردو اخباروں کی تعداد 35 سے زیادہ ہے۔

جنوبی ایشیاء سے باہر اُردو زبان خلیجِ فارس اور سعودی عرب میں جنوبی ایشیائی مزدور مہاجر بولتے ہیں۔ یہ زبان برطانیہ، امریکہ، کینیڈا، جرمنی، ناروے اور آسٹریلیا میں مقیم جنوبی ایشیائی مہاجرین بولتے ہیں۔

سرکاری حیثیت

اُردو پاکستان کی قومی زبان ہے اور یہ پورے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے. یہ تعلیم، اَدب، دفتر، عدالت، وسیط اور دینی اِداروں میں مستعمل ہے. یہ ملک کی سماجی و ثقافتی میراث کا خزانہ ہے.

اُردو بھارت کی سرکاری زبانوں میں سے ایک ہے. یہ بھارتی ریاستوں آندھرا پردیش، بہار، جموں و کشمیر، اُتر پردیش، جھارکھنڈ، دارالخلافہ دہلی کی سرکاری زبان ہے۔ اس کے علاوہ مہاراشٹر، کرناٹک، پنجاب اور راجستھان وغیرہ ریاستوں میں بڑی تعداد میں بولی جاتی ہے۔ بھارتی ریاست مغربی بنگال نے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے رکھا ہے۔

اردو زبان کی ابتداء کے متعلق نظریات

زبان اردو کی ابتداء و آغاز کے بارے میں کئی مختلف و متضاد نظریات ملتے ہیں یہ آپس میں اس حد تک متضاد ہیں کہ ایک انسان چکرا کر رہ جاتا ہے۔ ان مشہور نظریات میں ایک بات مشترک ہے کہ ان میں اردو کی ابتداء کی بنیاد برصغیر پاک و ہند میں مسلمان فاتحین کی آمد پر رکھی گئی ہے۔ اور بنیادی استدلال یہ ہے کہ اردو زبان کا آغاز مسلمان فاتحین کی ہند میں آمد اور مقامی لوگوں سے میل جول اور مقامی زبان پر اثرات و تاثر سے ہوا۔ اور ایک نئی زبان معرض وجود میں آئی جو بعد میں اردو کہلائی۔ کچھ ماہرین لسانیات نے اردو کی ابتدا ءکا سراغ قدیم آریائو ں کے زمانے میں لگانے کی کوشش کی ہے۔ بہر طور اردو زبان کی ابتداء کے بارے میں کوئی حتمی بات کہنا ذرا مشکل ہے۔ اردو زبان کے محققین اگرچہ اس بات پر متفق ہیں کہ اردو کی ابتداء مسلمانوں کی آمد کے بعد ہوئی لیکن مقام اور نوعیت کے تعین اور نتائج کے استخراج میں اختلاف پایا جاتا ہے ۔

اردو کی ابتداء کے بارے پروفیسر محمود شیرانی کا یہ استدال بڑا وزن رکھتا ہے کہ غزنوی دور میں جو ایک سو ستر سال تک حاوی ہے ایسی بین الاقوامی زبان ظہور پذیر ہو سکتی ہے۔ اردو چونکہ پنجاب میں بنی اس لیے ضروری ہے کہ وہ یا تو موجودہ پنجابی کے مماثل ہو یا اس کے قریبی رشتہ دار ہو۔ بہرحال قطب الدین ایبک کے فوجی اور دیگر متوسلین پنجاب سے کوئی ایسی زبان ہمراہ لے کر روانہ ہوئے جس میں خود مسلمان قومیں ایک دوسرے سے تکلم کر سکیں اور ساتھ ہی ہندو اقوام بھی اس کو سمجھ سکیں اور جس کو قیام پنجاب کے زمانے میں وہ بولتے رہے ہیں۔ یوں محققین کی ان آراء کے بعد یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ قدیم اردو کا آغاز جدید ہند آریائی زبانوں کے طلوع کے ساتھ 1000ء کے لگ بھگ اس زمانے میں ہو گیا جب مسلم فاتحین مغربی ہند (موجودہ مغربی پاکستان) کے علاقوں میں آباد ہوئے اور یہاں اسلامی اثرات بڑی سرعت کے ساتھ پھیلنے لگے۔

اردو زبان کی ابتدا کے متعلق نظریات

اردو کی ابتدا و آغاز کے بارے میں کئی مختلف و متضاد نظریات ملتے ہیں یہ آپس میں اس حد تک متضاد ہیں کہ ایک انسان چکرا کر رہ جاتا ہے۔ ان مشہور نظریات میں ایک بات مشترک ہے کہ ان میں اردو کی ابتدا کی بنیاد برصغیر پاک و ہند میں مسلمان فاتحین کی آمد پر رکھی گئی ہے۔ اور بنیادی استدلال یہ ہے کہ اردو زبان کا آغاز مسلمان فاتحین کی ہند میں آمد اور مقامی لوگوں سے میل جول اور مقامی زبان پر اثرات و تاثر سے ہوا۔ اور ایک نئی زبان معرض وجود میں آئی جو بعد میں اردو کہلائی۔ کچھ ماہرین لسانیات نے اردو کی ابتدا کا سراغ قدیم آریائوں کے زمانے میں لگانے کی کوشش کی ہے۔ بہر طور اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں کوئی حتمی بات کہنا ذرا مشکل ہے۔ اردو زبان کے

محققین اگرچہ اس بات پر متفق ہیں کہ اردو کی ابتدا مسلمانوں کی آمد کے بعد ہوئی لیکن مقام اور نوعیت کے تعین اور نتائج کے استخراج میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس انداز سے اگر اردو کے متعلق نظریات کو دیکھا جائے تو وہ نمایاں طور پر چار مختلف نظریات کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

دکن میں اردو

نصیر الدین ہاشمی اردو زبان کا سراغ دکن میں لگاتے ہیں۔ ان کا بنیادی استدلال یہ ہے کہ طلوع اسلام سے بہت پہلے عرب ہندوستان میں مالابار کے ساحلوں پر بغرض تجارت آتے تھے۔ تجارت کے ضمن میں ان کے تعلقات مقامی لوگوں سے یقیناً ہوتے تھے روزمرہ کی گفتگو اور لین دین کے معاملات میں یقیناً انہیں زبان کا مسئلہ درپیش آتا ہوگا۔ اسی میل میلاپ اور اختلاط و ارتباط کی بنیاد پر نصیر الدین ہاشمی نے یہ نظریہ ترتیب دیا کہ اس قدیم زمانے میں جو زبان عربوں اور دکن کے مقامی لوگوں کے مابین مشترک وسیلۂ اظہار قرار پائی وہ اردو کی ابتدائی صورت ہے۔ جدید تحقیقات کی روشنی میں یہ نظریہ قابلِ قبول نہیں۔ ڈاکٹر غلام حسین اس نظریے کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں اسی طرح دیکھا جائے تو جنوبی ہند (دکن) کے مقامی لوگوں کے ساتھ عربوں کے تعلقات بالکل ابتدائی اور تجارتی نوعیت کے تھے۔ عرب تاجروں نے کبھی یہاں مستقل طور پر قیام نہیں کیا یہ لوگ بغرض تجارت آتے، یہاں سے کچھ سامان خریدتے اور واپس چلے جاتے۔ طلوعِ اسلام کے ساتھ یہ عرب تاجر، مالِ تجارت کی فروخت اور اشیائے ضرورت کے تبادلے کے ساتھ ساتھ تبلیغ اسلام بھی کرنے لگے۔ اس سے تعلقات کی گہرائی تو یقیناً پیدا ہوئی مگر تعلقات استواری اور مضبوطی کے اس مقام تک نہ پہنچ سکے جہاں ایک دوسرے کا وجود ناگزیر ہو کر یگانگت کے مضبوط رشتوں کا باعث بنتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ نزدیکی اور قرب پیدا نہ ہو سکا جہاں زبان میں اجنبیت کم ہو کر ایک دوسرے میں مدغم ہو جانے کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ عربوں کے یہ تجارتی و مقامی تعلقات لسانی سطح پر کسی بڑے انقلاب کی بنیاد نہ بن سکے، البتہ فکری سطح پر ان کے اثرات کے نتائج سے انکار نہیں۔

سندھ میں اردو

یہ نظریہ سید سلیمان ندوی کا ہے جس کے تحت ان کا خیال ہے کہ مسلمان فاتحین جب سندھ پر حملہ آور ہوئے اور یہاں کچھ عرصے تک ان کی باقاعدہ حکومت بھی رہی اس دور میں مقامی لوگوں سے اختلاط و ارتباط کے نتیجے میں جوزبان وجود پزیر ہوئی وہ اردو کی ابتدائی شکل تھی۔ ان کے خیال میں:

مسلمان سب سے پہلے سند ھ میں پہنچے ہیں اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو "
"کہتے ہیں۔ اس کا ہیولیٰ اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ سندھ میں مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت اور تمدن و کلچر کا اثر مستقل اثرات کا حامل ہے۔ مقامی لوگوں کی زبان، لباس اور رہن سہن میں دیرپا اور واضح تغیرات سامنے آئے ہیں بلکہ عربی زبان و تہذیب کے اثرات سندھ میں آج تک دیکھے اور محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ آج سندھی زبان میں عربی کے الفاظ کی تعداد پاکستان و ہند کی دوسری تمام زبانوں کی نسبت زیادہ ہے اس کا رسم الخط بھی عربی سے بلاو اسطہ طور پر متاثر ہے۔ عربی اثرات کی گہرائی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ بعض مورخین کے نزدیک دوسری زبانوں میں جہاں دیسی زبانوں کے الفاظ مستعمل ہیں وہاں سندھی میں عربی الفاظ آتے ہیں مثال کے طو ر پر سندھی میں پہاڑ کو "جبل" اور پیاز کو "بصل" کہنا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ اثرات زبان میں الفاظ کے دخول سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اس لیے کوئی مشترک زبان پیدا نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ سید سلیمان ندوی اپنے اس دعوےٰ کا کوئی معقول ثبوت نہیں دے سکے۔ بقول ڈاکٹر غلام حسین:

اس بارے میں قطعیت سے کچھ نہیں کہا جاسکتا ابتدائی فاتحین عرب تھے جن کے خاندان یہاں آباد " ہو گئے۔ نویں صدی میں جب ایران میں صفاریوں کا اقتدار ہوا تو ایرانی اثرات سندھ اور ملتان پر ہوئے۔ اس عرصہ میں کچھ عربی اور فارسی الفاظ کا انجذاب مقامی زبان میں ضرور ہوا ہوگا اس سے "کسی نئی زبان کی ابتداء کا قیاس شاید درست نہ ہوگا۔

اس دور کے بعض سیاحوں نے یہاں عربی، فارسی اور سندھی کے رواج کا ذکر ضرور کیا ہے مگر ان بیانات سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ یہاں کسی نئی مخلوط زبان کا وجود بھی تھا۔ البتہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ سندھی اور ملتا نی میں عربی اور فارسی کی آمیزش ہوئی ہوگئی۔ اس آمیز ش کا ہیولیٰ قیاس کرنا کہاں تک مناسب ہے۔ خاطر خواہ مواد کی عدم موجودگی میں اس کا فیصلہ کرنا دشوار ہے۔

پنجاب میں اردو

حافظ محمود شیرانی نے اپنے گہرے لسانی مطالعے اور ٹھوس تحقیقی بنیادوں پر یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ اردو کی ابتداء پنجاب میں ہوئی۔ ان کے خیال کے مطابق اردو کی ابتداء اس زمانے میں ہوئی جب سلطان محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری ہندوستان پر باربار حملے کر رہے تھے۔ ان حملوں کے نتیجے میں فارسی بولنے والے مسلمانوں کی مستقل حکومت پنجاب میں قائم ہوئی اور دہلی کی حکومت کے قیام سے تقریباً دو سو سال تک یہ فاتحین یہاں قیام پزیر رہے۔ اس طویل عرصے میں زبان کا بنیادی ڈھانچہ صورت پزیر ہوا اس نظریے کی صداقت کے ثبوت میں شیرانی صاحب نے اس

علاقے کے بہت سے شعراء کا کلام پیش کیا ہے۔ جس میں پنجابی،فارسی اور مقامی بولیوں کے اثرات سے ایک نئی زبان کی ابتدائی صورت نظرآتی ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"سلطان محمود غزنوی کی فتوحا ت کے ساتھ ساتھ برصغیر کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ فتوحات کا یہ سلسلہ 1000ء سے 1026ء تک جاری رہا اور پنجاب و سندھ کے علاوہ قنوج، گجرات (سومنات) متھرا اور کالنجر تک فاتحین کے قدم پہنچے لیکن محمود غزنوی نے ان سب مفتوحہ علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل نہ کیا البتہ 1025ء میں لاہور میں اپنا نائب مقرر کرکے پنجاب کو اپنی قلم رو میں شامل کر لیا۔ نئے فاتحین میں ترک اور افغان شامل تھے۔ غزنوی عہد میں مسلمان کثیر تعداد میں پنجاب میں آباد ہوئے، علماء اور صوفیا نے یہاں آکر رشد و ہدایت کے مراکز قائم کیے اور تبلیغ دین کا سلسلہ شروع کیا جس کے نتیجے میں مقامی باشندے گروہ درگروہ اسلام قبول کرنے لگے اس سماجی انقلاب کا اثر یہاں کی زبان پر پڑا۔ کیونکہ فاتحین نے پنجاب میں آباد ہو کر یہانکی زبان کو بول چال کے لیے اختیار کیا۔ اس طرح غزنوی دور میں مسلمانوں کی اپنی زبان، عربی، فارسی اور ترکی کے ساتھ ایک ہندوی زبان کے خط و خال نمایا ں ہوئے۔"

مسلمان تقریباً پونے دو سو سال تک پنجاب، جس میں موجودہ سرحدی صوبہ اور سندھ شامل تھے حکمران رہے۔ 1193ء میں قطب الدین ایبک کے لشکروں کے ساتھ مسلمانوں نے دہلی کی طرف پیش قدمی کی اور چند سالوں کے بعد ہی سارے شمالی ہندوستان پر مسلمان قابض ہوگئے۔ اب لاہور کی بجائے دہلی کو دارالخلافہ کی حیثیت حاصل ہو گئی تو لازماً مسلمانوں کے ساتھ یہ زبان جو اس وقت تک بول چال کی زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی، ان کے ساتھ ہی دہلی کی طر ف سفر کر گئی۔

تاریخی اور سیاسی واقعات و شواہد کے علاوہ پرفیسر محمود خان شیرانی، اردو اور پنجابی کی لسانی شہادتوں اور مماثلتوں سے دونوں زبانوں کے قریبی روابط و تعلق کو واضح کرکے اپنے اس نظرے کی صداقت پر زور دیتے ہیں کہ اردو کا آغاز پنجاب میں ہوا۔ فرماتے ہیں: "اردو اپنی صرف و نحو میں پنجابی و ملتانی کے بہت قریب ہے۔ دونوں میں اسماء و افعال کے خاتمے میں الف آتا ہے اور دونوں میں جمع کا طریقہ مشترک ہے یہاں تک کہ دونوں میں جمع کے جملوں میں نہ صرف جملوں کے اہم اجزاء بلکہ ان کے توابعات و ملحقات پر بھی ایک باقاعدہ جاری ہے۔ دنوں زبانیں تذکیر و تانیث کے قواعد، افعال مرکبہ و توبع میں متحد ہیں پنجابی اور اردو میں ساٹھ فی صدی سے زیادہ الفاظ مشترک ہیں۔"

مختصراً پروفیسر شیرانی کی مہیا کردہ مشابہتوں اور مماثلتوں پر نظر ڈالیں تو دونوں زبانوں کے لسانی رشتوں کی وضاحت ہو جاتی ہے اور یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اردو اپنی ساخت اور صرفی و نحوی خصوصیات کی بناء پر پنجابی زبان سے بہت زیادہ قریب ہے اور اس سے بھی پروفیسر موصوف کے استدلال کو مزید تقویت پہنچتی ہے۔

الغرض اگر ہم پروفیسر شیرانی کی تحقیق پر تنقیدی نظر ڈالیں تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ واقعی اردو اپنی ہیئت ساخت اور صرف و نحو کی خصوصیات کی بنا پر پنجابی سے قریب تر ہے۔ مثلاً

1 ۔ اردو اور پنجابی میں تذکیر و تانیث کے قواعد یکساں ہیں۔ مثلاً اکثر الفاظ جو الف پر ختم ہوں اگر ان کی تانیث کرنی مقصود ہو تو ''الف ''کو '' ی'' میں بدل دیا جاتا ہے۔ مثلاً بکرا، بکری۔ گھوڑا، گھوڑی۔ کالا ، کالی وغیرہ

2 ۔ مصدر کا قاعدہ بھی دونوں زبانوں میں یکساں ہے۔ یعنی فعل امر کے آخر میں ''نا'' کے اضافے سے مصدر بنایا جاتاہے۔

3 ۔ فعل تذکیر و تانیث دونوں میں اپنے فاعل کی حالت کے مطابق آتا ہے۔ مثلاً گھوڑی آئی (اردو) کوڑی (آئی (پنجابی) لڑکا آیا (اردو) منڈا آیا(پنجابی

4 ۔فعل لازم سے فعل متعدی بنانے کے قاعدے بھی دونوں زبانوں میں یکساں ہیں جیسے سیکھنا سےسکھانا (اردو)، سکھنا سے سکھانا (پنجابی) بیٹھنا سے بٹھانا (اردو) اور بہنا سے بہانا (پنجابی)

اس کے علاوہ ماضی مطلق، ماضی احتمالی شکیّہ، مضارع، مستقبل کے اصول، مضارع، امر کے قاعدے، معروف و مجہول، دعائیہ، ندائیہ کے اصول و ضوابط دونوں زبانوں میں یکساں ہیں۔

یاد رہے کہ ''پنجاب میں اردو'' کی اشاعت سے قبل مولانا محمد حسین آزاد کے پیش کردہ نظریے کو ہی قبولیت عام حاصل تھی مگر حافظ صاحب کی کتاب نے تحقیق کے تمام تر دروازے پنجاب کی سرزمین کی طرف وا کر دئیے۔ خود حضرت علامہ محمد اقبال کو جب نصیر الدین ہاشمی نے اپنی تصنیف ''دکن میں اردو'' پیش کی تو انہوں نے کہا: '' غالباً پنجاب میں بھی کچھ پرانا مسالا موجود ہے۔ اگر اس کے جمع کرنے میں کسی کو کامیابی ہو گی تو مورخ اردو کے لیے نئے سوالات پیدا ہوں گے''۔

پروفیسر سینٹی کمار چیٹر جی نے بھی پنجاب میں مسلمان فاتحین کے معاشرتی اور نسلی اختلاط کا ذکر کیا ہے اور ڈاکٹر زور کے نقطہ نظر کی تائید کی ہے۔ ان کے خیال میں قدرتی طور پر مسلمانوں نے جو زبان ابتداً اختیار کی وہ وہی ہوگی جو اس وقت پنجاب میں بولی جاتی تھی وہ کہتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں پنجابی زبان خاص طور پر مشرقی پنجاب اور یو پی کے مغربی اضلاع کی بولیوں

میں کچھ زیادہ اختلاف نہیں اور یہ فرق آٹھ، نوسو سال پہلے تو اور بھی زیادہ کم ہوگا۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ وسطی و مشرقی پنجاب اور مغربی یوپی میں اس وقت قریباً ملتی جلتی بولی رائج ہو۔
مزید براں پروفیسر موصوف حافظ محمود شیرانی کی اس رائے سے بھی متفق دکھائی دیتے ہیں کہ پنجاب کے لسانی اثرات کا سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا۔
حافظ محمود شیرانی کی تالیف "پنجاب میں اردو" کی اشاعت کے ساتھ ہی مولانا محمد حسین آزاد کے نظریے کی تردید ہو گئی جس میں وہ زبان کی ابتداء کے بارے میں اردو کا رشتہ برج بھاشا سے جوڑتے ہیں۔ پنجاب میں اردو کا نظریہ خاصہ مقبول رہا مگر پنڈت برج موہن و تاتریہ کیفی کی تالیف "کیفیہ" کے منظر عام پر آنے سے یہ نظریہ ذرا مشکوک سا ہو گیا۔ مگر خود پنڈت موصوف اردو کی ابتداء کے بارے میں کوئی قطعی اور حتمی نظریہ نہ دے سکے۔ یوں حافظ محمودشیرانی کے نظریے کی اہمیت زیادہ کم نہ ہوئی۔

Q.NO.02

سرسید احمد خاں ایک مختلف الحیثیات شخص تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں سیاسی، تعلیمی، ادبی، تحقیقی اورمذہبی غرض ہر قسم کے علمی اور قومی مشاغل میں حصہ لیا۔ انہوں نے نہ صرف علمی میدان میں اپنا گہرا نقش بٹھایا بلکہ ہر جگہ دیرپا اثرات چھوڑے ۔
جہاں تک اردو زبان و ادب کا سوال ہے تو وہ اردو کے اولین معماروں میں تھے۔ تعلمی معاملات میں ان کے خاص نظریات نے علی گڑھ تحریک کی صورت اخیات کی اور دینیات میں بھی انہوں نے فکر وتصور کے نئے راستے دریافت کئے۔ غرض علم و عمل کے تقریباً ہر شعبے میں ان کی عظیم شخصیت نے مستقل یادگار چھوڑی ہیں۔
سرسید کے کارناموں کی فہرست لمبی ہے۔ اردو زبان وادب سے ان کی دلچسپی سب سے زیادہ رہی ہے۔ انہوں نے نہ صرف اردو زبان کی حفاظت کی بلکہ اسے غیر معمولی ترقی دے کر اردو ادب کے نشو و نما و ارتقاء میں نمایاں حصہ لیا۔ انہوں نے اردو نثر کو اجتماعی مقاصد سے روشاس کرایا اور اسے عام فہم ، آسان اور سلیس بناکر عام اجتماعی زندگی کا ترجمان بنایا۔ ان سے پہلے نثر میں عام طور پر مضمون و معنی کو ثانوی اور طرز بیان کو اولین اہمیت دی جاتی تھی۔ مگر انہوں نے مضمون کو اولیت عطا کی۔ تکلف اور تصنع ، بوجھل الفاظ اور عبارات آرائی کے خلاف ریزوں سے مالا مال کردیا۔
سرسید احمد خاں کی تصانیف کو تاریخی ترتیب کی روشنی میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ

نہایت اثر پذیر شخص تھے۔ وہ جس ماحول میں رہے اس کا اثر قبول کیا۔ ان کے رجحانات اور مذاق تصنیف کی پیہم تبدیلیاں یہ بھی ثابت کرتی ہیں کہ ان میں جلد جلد بدلی جانے کی بے حد صلاحیت تھی۔ ان کی تصانیف مضامین اور اسلوب بیان دونوں ارتقا اور تغیر کا عجیب و غریب نقشہ پیش کرتی ہیں۔ ان کی زندگی کا ابتدائی اور خاندانی روایات میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد جب انہوں نے ملازمت شروع کر دی تو پرانی ڈگر سے ہٹ کر وہ مستقرین یوروپ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن پہلی جنگ آزادی جسے غدر کا نام دیا گیا کے بعد ان کا ذہن زندگی کے جدید تر ااور عجیب تر مسائل سے دوچار ہوجاتاہے۔ ان کی زندگی میں مغربی خیالات و رحجانات کو فروغ اس وقت ملتا ہے۔ جب وہ انگلستان کا سفر کرتے ہیں۔ انگلستان کے سفر کے بعد جو رنگ ان پر چڑھتا ہے وہ اخیر وقت تک ان کے ساتھ رہتا ہے۔ اور یہی رنگ انہیں اس صدی کے دوسرے ارباب فکر کے مقابلہ میں خاص امتیاز بخشتا ہے۔ ایک ایسا امتیاز جو زندگی کے نئے رنگ یعنی جدید نظریہ حیات کے پہلے بڑے نمائندہ و شارح تھے۔ دوسرے بہت سے لوگوں نے نہ صرف ان سے اثر قبول کیا بلکہ ان کی پیروی کی۔ .

پہلی جنگ آزادی (غدر) سے پہلے ان کے اندر دو رجحانات نظر آتے ہیں۔ پہلا یہ کہ وہ پرانے رنگ میں ڈوبے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور دوسرا یہ کہ انگریزوں سے میل جول کی بناپر ان کے اندر مغربی طرز زندگی اور جدید خیالات کا کچھ نہ کچھ اثر دکھائی دیتا ہے۔ ریاضی، تاریخ اور تصوف کے علاوہ ان کی تصنیفی زندگی کے دور اول میں ان کی تحریروں میں مناظرہ و تقابل مذہب کا رجحان غالب ہے۔ اس دور میں ان کا نقطۂ نظر علمی اور دینی تھا۔ اس کے علاوہ اس دور میں وہ آثار قدیمہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس دور کی خاص خاص تصانیف ''جام جم'' (فارسی) ۱۸۳۹ء، ''انتخاب الاخوین''، ''جلاء القلوب بذکر المحبوب'' ، ''تحفۃ حسن''، ''آثار الصنادید''، ''فوائد الافکار''، ''کلمۃ الحق'' ، ''راہ سنت و رد بدعت''، ''ضیقہ'' ، ''کیمیائے سعادت''، ''تاریخ ضلع بجنور'' اورآئین اکبر کی تصحیح''وغیرہ ہیں۔ .

پہلی جنگ آزادی کے بعد ان کا تبادلہ بجنور سے مراد آباد ہوگیا ۔ اس دور میں وہ مسلمانوں کو غدر میں شرکت کے الزام سے بچانے کی کوشش میں لگ گئے۔ اس الزام سے بچانے کے لئے انہوں نے کئی کتابیں لکھیں جن میں ''تاریخ سرکش بجنور'' ، ''اسباب بغاوت ہند'' اور ''رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا'' وغیرہ اہم ہیں۔ اس دور میں انہوں نے ''تاریخ فیرزو شاہی'' ''تبین الکلام'' ، ''سائنسٹی فک سوسائٹی اخبار'' (جو بعد میں ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' ہوگیا) اور ''رسالہ احکام طعام اہل کتاب'' وغیرہ بھی لکھیں۔ .

تیسرے دور میں ان کے مصلحانہ خیالات میں بڑی شدت پیدا ہوگئی تھی۔ اب وہ اپنے اظہار خیال میں نڈر اور بے خوف ہوگئے تھے اور پبلک کی مخالفت کو کچھ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ان کے ذہن پر جدید انداز فکر نے غلبہ پالیا تھا۔ انگریزوں کی صحبت و رفاقت نے جو رنگ ان پر چڑھایا تھا وہ تیز تر اور شوخ ہوگیا تھا۔ اس رجحانات کو ان کی اس دور کی تصانیف میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ اس دور کی اہم تصانیف اس طرح ہیں۔ ''سفرنامہ لندن''، ''خطبات احمدیہ'' ، ''تہذیب الاخلاق'' ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو'' وغیرہ۔

اس طرح سرسید کے فکر وعمل کے دو ہی اہم میدان تھے ایک مذہب دوسرا سیاست لیکن ان کی ادبی حیثیت بھی ہر لحاظ سے مسلم ہے۔

ان کے نزدیک علم و ادب صرف تفریحی مشغلہ نہ تھا بلکہ ان کے لیے یہ چند مخصوص خیالات و عقائد کے اظہار کا وسیلہ تھا۔ وہ ادب کو مقاصد زندگی کا آلۂ کار سمجھتے تھے۔

سرسید احمد کا محبوب مشغلہ تصنیف و تالیف اور مطالعہ تھا پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ شعر وادب کی ترقی کے لیے کوشش نہ کرتے۔ اردو نثر نظم کی خامیوں سے وہ پوری طرح واقف تھے۔ اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے انہوں نے اہل قلم کو بہت سے مفید مشورے بھی دیئے۔ نورالحسن نقوی لکھتے ہیں:

وہ ادب کی معصومیت و افادیت کے علمبردار تھے۔ وہ قصے کہانیاں جو محض وقت گزاری کا ذریعہ ہوں اور وہ شاعری جس کا مقصد صرف لطف اندوزی ہو ان کے لیے قابل تفریح تھے۔ وہ سلادینے والے نہیں، بیدار کرنے والے شعر وادب کے قائل تھے''

Q.NO.03

علامہ اقبال نسلاً کشمیری برہمنوں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتے تھے جنہیں سپرو برہمن کے نام سے جانا جاتا تھا ۔ آپ کا اصل وطن کشمیر تھا لیکن آپ کے جدا علی ایک بزرگ کی عقیدت کی وجہ سے مشرف بہ اسلام ہوئے اور سیالکوٹ چلے آئے۔اقبال کو اس بات پر ندامت تھی کہ ان کے آباو اجداد کا فرو بت پرست تھے لیکن ساتھ ہی انہیں اس بات پر فخر بھی تھاکہ ان کا خاندان علمی حیثیت سے اعلی و ارفع تھا ۔ آپ کے خاندان کے لوگ فلسفہ حکمت کے ماہر ہوا کرتے تھے جس پر علامہ اقبالؒ نے خاکسارانہ لہجے میں فخر بھی کیا ہے ۔

میں اصل کا خاص سومناتی

آبا مرے لاتی و مناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد
میری کفِ خاک برہمن زاد
ہے فلسفہ میری آب و گل میں
پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں

:ولادت

اقبال کے دادا شیخ محمد رفیق سیالکوٹ میں آباد تھے جن کے پاس دو بیٹے تھے ایک کا نام نور محمد اور دوسرے کا غلام قادر ، نور محمد بڑے تھے جن کی شادی امام بی بی نام کی ایک خاتون سے ہوئی تھی ،جن کے بطن سے چھے بچے پیدا ہوئے تین بیٹے اور تین بیٹیاں، ان تین بیٹوں میں اقبال سب سے چھوٹے تھے ،جن کی تاریخ پیدائش کے تعلق سے مختلف سوانح نگار نے مختلف تاریخیں لکھی ہیں لیکن ۹ نومبر ۱۸۷۷ ء کو ان کی تاریخ ولادت کے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہ ۔
نورالحسن نقوی لکھتے ہیں کہ '' محققین نے تلاش و جستجو کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ۹ نومبر ۱۸۷۷ ء مطابق ۳ ذی قعدہ ۱۲۹۶ ھ کو ان کی ولادت ہوئی ۔
آپ کے والد زیادہ تعلیم یافتہ تو نہیں تھے لیکن ان پر تصوف کا گہرا رنگ تھا وہ اپنے اخلاق اور مذہبی پاکیزگی کی وجہ سے قابل احترام تسلیم کیے جاتے تھے۔ اقبال کی پیدائش کے ضمن میں ان کے ایک خواب کا تذکرہ عبدالسلام ندوی نے اپنی کتاب اقبال کامل میں کیا ہے ۔ شیخ نور محمد کی زبانی خواب کا ذکر یوں ہے کہ ''ایک بڑا ہی عجیب و غریب پرندہ فضا میں زمین کے قریب اڑرہا ہے اور بڑی کثرت سے لوگوں کا ہجوم ہے ،اس ہجوم میں میں بھی ہوں ۔ وہ پرندہ کسی کی کوشش سے ہاتھ نہیں آتا لیکن خود بخود میرے دامن میں آکر گرا اور میں نے اس کو پکڑ لیا ۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب پیدا ہوئے تو انہوں نے یہ تاویل کی کہ وہ پرندہ یہی بچہ ہے ،اور یہ ضرور کوئی غیر معمولی کمال پیدا کرےگا''

: تعلیم و تربیت

اقبال کی تعلیم و تربیت میں ان کے والد محترم کا اہم رول رہا ہے جس کا ذکر اقبال نے بہت فخر سے کیا ہے ۔ ایک خط میں اقبال لکھتے ہیں کہ '' ہزاروں کتب خانے ایک طرف اور باپ کی نگاہ شفقت ایک طرف ''

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال اپنی منزل کی آخری حد تک خود کی لگن اور کوشش سے پہو نچے ،لیکن راہ دکھانے والے بلاشبہ آپ کے والد ہی تھے۔ آپ کے والد آپ کی وفات سے صرف آٹھ سال

پہلے ۱۷ اگست ۱۹۳۰ء کو آپ کو داغ مفارقت دے گئے ۔

آپ کی تربیت کے سلسلے میں دوسرا اہم نام آپ کی والدہ محترمہ کا ہے آپ کی والدہ امام بی بی کو بی جی بھی کہا جاتا تھا ۔ یہ زیادہ تعلیم یافتہ تو نہیں تھیں لیکن انہوں نے اقبال کی تربیت کا فریضہ بحسن و خوبی انجام دیا ۔ انہوں نے اقبال کے دل میں ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر دیاتھا جو مرتے دم تک برقرار رہا ۔ ماں کی اس تربیت کو اقبال نے یوں بیان کیا ۔

تربیت سے تیری میں انجم کاہم قسمت ہوا
گھر میرے اجداد کا سرما یۂ عزت ہو

اس کے علاوہ اقبال نے اپنی ماں کا مرثیہ ’’والدہ مرحومہ کی یاد میں ‘‘ لکھ کر اپنی ماں کو خراج عقیدت پیش کیا، اقبال کا درد ملاحظہ کریں۔

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ میرا انتظار
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بیقرار
خاک و قد پہ تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعا ہے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا

اور آخری شعر بھی دیکھیں جو اب ضرب المثل کی قدرت اختیار کر چکا ہے ۔

آسماں تری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نَورُستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

آپ کی تربیت میں آپ کے بڑے بھائی شیخ محمد عطا کی شخصیت بھی بہت اہم ہے ،یہ آپ سے بے پناہ محبت کرتے تھے آپ جب انگلستان گئے تو آپ کے تعلیمی مصارف شیخ محمد عطا نے ہی برداشت کئے جن کے متعلق نظم ’’ التجائے مسافر‘‘ میں اقبال نے یہ اشعار کہے۔

وہ میرا ہوسف ثانی ،وہ شمع محفل عشق
ہوئی ہے جس کی اخوت قرار جاں مجھ کو
جلا کے جس کی محبت نے دفترِ من و تو
ہوائے عیش میں پالا ،کیا جواں مجھ کو
ریاض دہر میں مانند گل رہے خنداں
کہ ہے عزیز تراز جاں وہ جان جاں مجھ کو

شیخ عطا کی وفات دسمبر ۱۹۴۰ ء میں ہوئی۔

: تعلیم

شیخ نور محمد چونکہ دین دار آدمی تھے اسلئے وہ بیٹے کو بھی دینی تعلیم ہی دلانا کافی سمجھتے تھے ،شیخ نور محمد کے سیالکوٹ کے اکثر مقامی علماء کے ساتھ دوستانہ راسم تھے ،چناچہ اقبال کو صرف چار سال چار مہینے کی عمر میں ہی مولانا غلام حسن کے سپرد کرکے محلہ شوالہ کی مسجد میں ابتدائی تعلیم کے لئے بٹھادیا گیا،حسبِ دستور قرآن شریف کی تعلیم سے ابتداء ہوئی تقریباً ایک سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا ،اسی درمیان شیخ نور محمد کے جاننے والے ایک شاہ صاحب سید میر حسن کے مشورے سے یہ طے ہوا کہ اقبال کی تعلیم صرف درس قرآن تک ہی محدود نہ رہے بلکہ اس کے علاوہ بھی انہیں تعلیم دی جائے۔ چنانچہ سید میر حسن کو ہی اقبال کی تعلیم کی ذمہ داری دی گئی۔ شیخ نور محمد کے مکان کے قریب ہی شاہ صاحب کا مکتب تھا ،یہاں اقبال نے اردو فارسی اور عربی کی تعلیم بھی حاصل کرنی شروع کی ، کچھ ہی دنوں بعد شاہ صاحب یعنی سید میر حسن اسکاچ مشن اسکول میں پڑھانے لگے تو اقبال بھی وہیں داخل ہوگئے ۔ اب اقبال انگریزی تعلیم سے بھی وابستہ ہوگئے اور پرانے معمولات اپنی جگہ باقی رہے ۔ اقبال نے یہیں سے ۱۸۹۱ء میں مڈل اور ۱۸۹۳ء میں میٹرک پاس کیا۔

اقبال میں ذکاوت و ذہانت کا مادہ خداداد تھا جس کے جواہرات شروع ہی سے نظر آنے لگے تھے اقبال کو امتحان میں نمایاں کامیابی کی وجہ سے تمغہ اور سرکاری وظیفہ حاصل ہوا۔ ۱۸۹۵ء میں اقبال نے اسکاچ مشن سے انٹر میڈیت کی تعلیم مکمل کی پھر اعلی تعلیم کے لئے لاہور چلے گئے ۔لیکن لاہور جانے سے پہلے تک انہیں سید میر حسن جیسے استاد سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ،اور یہ اقبال کی خوش قسمتی تھی۔سید میرحسن جو کہ ریاصیات اور لسانیات پر تو نظر رکھتے ہی تھے لیکن ساتھ ہی انہیں ادبیات سے بھی گہرا لگاؤ تھا ۔ ان کو اردو اور پنجابی کے ہزار ہا اشعا ر یاد تھے ایک شعر کی تشریح میں بیسیوں اشعار اس مضمون کے متعلق سنا دیتے ۔ جس سے شعر کا مفہوم واضح ہو ہی جاتا تھا لیکن ساتھ ہی طلباء کے اندر شعری ذوق بھی پیدا ہو جاتا ۔اور یقینا اقبال کے دل میں بھی شعری ذوق یہیں پیدا ہوا ہوگا ۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال زندگی بھی اپنے اقتاد کے عقیدت مند رہے ۔ اقبال جب انگلشتان جا رہے تھے تو حضرت نظام الدین الیاء کے مزار پر ’’التجائے مسافر‘‘ کے نام سے جو نظم پڑھی اس میں استاد کے علمی احسان کا اعتراف اقبال نے بڑے ہی عقیدت مندانہ طور پر کیا ہے ۔

وہ شمع بازگہ خاندان مرتضوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھ کو

نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خدا وند آسمان و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادما ں مجھ کو

شاگرد کی استاد سے عقیدت کاعالم یہ تھا کہ جب برطانوی حکومت کی طر ف سے اقبال کو ''سر'' کا خطاب دیا جارہا تھا تو انہوں نے اس کو اس شرط کے ساتھ قبول کیا کہ ان کے استاد کو شمش العلماء کا خطاب دیا جائے ۔

اقبال نے ۱۸۹۷ء میں بی ۔ اے کی تعلیم گورنمنٹ کالج لاہورسے مکمل کی اور ۱۸۹۹ میں فلسفہ میں ایم ۔ اے کیا ۔ ایم ۔ اے کی تعلیم کے دوران اقبال کی ملاقات پروفیسر ٹی ۔ڈبلیو آرنلڈ سے ہوئی جن کی تعلیم و تربیت نے اقبال کے علمی جوہر کو اور بھی چمکا دیا اور پروفیسر آرنلڈ کا احسان اقبال کبھی نہ بھلا سکے ۔ ۱۹۰۴ء میں پروفیسر آرنلڈ جب انگستان چلے گئے تو اقبال نے ا ن کے رخصت ہونے پر ''نالئہ فراق'' کے نام سے ایک الوداعی نظم لکھی جس میں اقبال نے آرنلڈ کی صحبت سے پیدا ہونے والے علمی ذوق کا تذکرہ یوں کیا ہے ۔

تو کہاں ہے اے کلیم ذروئہ سینائے علم
تھی تری موجِ نفس باد نشاط افزائے علم
اب کہاں وہ شوق رہ پیمائی صحرائے علم
تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم
شور لیلیٰ کو کہ باز آرایش سودا کند
خاک مجنوں راغبارِ خاطر صحراکند

سفر انگلستان :

اقبال ستمبر ۱۹۰۵ ء میں انگلستان گئے وہاں پہنچ کر آپ نے کیمبرج یونیورسٹی کے ٹیرنٹی کالج میں داخلے لیا ۔ آپ نے وہاں جو تحقیقی مقالہ لکھا اسکا موضوع ''ایران میں فلسفہ ما بعدالطبیعات کا ارتقاء'' قرار پایا ۔ مقالہ انگریزی زبان میں لکھا گیا تھا جو میویخ یونیورسٹی میں پیش کیا گیا ۔ اس مقالے کا زبانی امتحان جرمن زبان میں ہوا ۔آپ تین سال انگلستان میں رہے ،یہاں آپ نے پی ۔ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ،بیرسٹری کا امتحان پاس کیا ، اس کے بعد چھے مہینے تک پروفیسر آرنلڈ کے قائم مقام کی حیثیت سے لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر بھی رہے ۔

انگلستان میں قیام کے دوران اہنیں میک ٹیگرٹ ،پروفیسر براؤن ،وائٹ ہیڈ،وارڈ اور لنکسن جیسی

شہر آفاق ہستیوں سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا ۔لندن میں قیام کے دوران اقبال نے بہت سارے اسلامی لکچر بھی دیئے۔ بالآخر جولائی ۱۹۰۸ میں آپ ہندوستان واپس آگئے ۔

:ملازمت

اقبال نے ایم ۔ اے کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہی ملازمت شروع کردی تھی آپ نے چار سال تک اورینٹل کالج میں ملازمت کی ،اسی درمیان چھے مہینے کی رخصت لے کر گورنمنٹ کالج میں انگریزی بھی پڑھائی ۔ اسکے بعد جب ۱۹۰۳ ء میں میکلوڈ عربک ریٹر کی حیثیت اورینٹل کالج سے اقبال کی ملازمت ختم ہوگئی تو اسی سال اقبال دوبارہ گورنمنٹ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے ملازمت کرنے لگے اور ۱۹۰۵ء میں رخصت لے کر انگلستان چلے گئے ۔ انگلستان سے واپسی کے بعد اقبال نے بیرسٹری شروع کی اور ساتھ ہی کچھ دنوں تک گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر بھی رہے۔

مارچ ۱۹۱۰ ء میں اقبال ملازمت کے غرض سے حیدرآباد گئے لیکن وہاں مستقل قیام کی صورت پیدا نہ ہوئی۔ کیونکہ اقبال کو معمولی ملازمت قبول نہ تھی اور پڑھنے پڑھانے سے وہ بہت حد تک تنگ آچکے تھے آخر کار حیدرآباد سے واپس آگئے ۔ لیکن اب حال یہ تھا کہ اقبال معلمی اور بیرسٹری کو ساتھ لیکر چلنے کو تیار نہ تھے اسلئے ۳۱دسمبر ۱۹۱۰ ء کو گورنمنٹ کالج سے الگ ہو گئے لیکن کالج سے الگ ہونے کے بعد بھی کسی نہ کسی حیثیت سے کالج سے تعلق قائم ہی رہا اور صرف ایک گورنمنٹ کالج لاہور ہی نہیں بلکہ دوسری بھی بڑی جامعات سے اقبال متعلق رہے ، پنجاب ، علی گڑھ ،حیدرآباد ،الہ آباد ،ناگپور وغیرہ بھی اقبال ممتحن کی حیثیت سے جاتے رہے ۔ ۱۹۱۹ ء میں اقبال اورینٹل فیکلٹی کے ڈین بنائے گئے ۱۹۲۳ ء میں تعلیمی کونسل کی رکنیت ملی ، اسی دوران پنجاب ٹیکسٹ بک کے بھی رکن رہے ۔ غرض یہ کہ ۱۹۳۲ء تک علامہ اقبال پنجاب یونیورسٹی سے جڑے رہے۔

:شاعری

علامہ اقبال کی شاعری پر ہر اظہار خیال کرنے والوں نے لکھا ہے کہ ان کی شاعری کا آغاز اسکول کے زمانے میں ہی ہو گیا تھا ۔ اس سلسلے میں شیخ عبدالقادر نے کہا کہ ’’ وہ ابھی اسکول ہی میں پڑھتے تھے کہ کلام موزوں زبان سے نکلنے لگا تھا ‘‘،پروفیسر عبدالقادر لکھتے ہیں کہ’’ جب وہ اسکول کی تعلیم ختم کرکے اسکاچ مشن کالج میں داخل ہوئے تو ان کی شاعری شروع ہوئی‘‘۔ ان دونوں قول کے اندر گرچہ معمولی سا اختلاف نظر آتا ہے لیکن اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اقبال کی شاعری کا آغاز ان ہی دنوں ہو گیا تھاجب وہ سیالکوٹ میں تھے ۔ جیسا کہ نورالحسن نقوی

بھی داغ کی شاگردی میں شامل ہونے کے متعلق لکھتے ہیں کہ '' غالب گمان یہ ہے کہ اقبال ۱۸۹۴ء کے آس پاس داغ کے حلقئہ تلامذہ میں شامل ہوچکے تھے ۔ داغ نے حیدرآباد میں اصلاح سخن کا دفتر قائم کر رکھا تھا جس کا باقاعدہ عملہ تھا اور ڈاک سے موصول ہونے والی غزلیں اصلاح دے کر واپس بھیجی جابی تھیں''اقبال جب لاہور آگئے تو یہاں ان کے شعری ذوق کو پروان چڑھنے کا موقع ملا کیونکہ لاہور ادب و شاعری کا بہت بڑا مرکز تھا۔یہاں کچھ لوگوں نے مل کر ایک چھوٹے سے مشاعری کی بنیاد ڈال رکھی تھی جن میں مرزا ارشد گورگانی دہلوی اور میر ناظم لکھنوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک بار اقبال اپنے کچھ دوستوں کے ذریعہ جبراً لائے گئے پھر اقبال نے اس مشاعرے میں جب یہ شعر پڑھا کہ ،

موتی سمجھ کر شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

''تو مرزا ارشد گورگانی نے کہا کہ '' اس نوجوان شاعر کا مستقبل بہت روشن ہے
اقبال ابھی تک تو غزلیں کہتے رہے لیکن اب انہوں نے نظمیں بھی لکھنی شروع کردیں ۔ ایک بار کسی ادبی مجلس میں انہوں نے اپنی ایک نظم ''ہمالہ'' سنایاتو لوگوں نے بہت پسند کیا ۔ لیکن ابھی اقبال کی شہرت صرف دوستوں اور لاہور کے کالجوں تک ہی محدود تھی۔پر جب شیخ عبدالقادر نے رسالہ ''مخزن '' نکالنے کی ٹھانی تو انہوں نے اقبال سے بہت اصرار کے بعد ان کی نظم ''ہمالہ '' کو بھی مخزن کی پہلی جلد میں شائع کیا ۔جس سے انکی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ بہت ساری انجمنیں اور مجلسیں درخواست کرنے لگیں کہ وہ سالانہ جلسوں میں لوگوں کو اپنا کلام سنائیں۔ اس طرح ان کی شہرت بڑھتی گئی اور فرمایشوں کی بھرمار ہونے لگیں تو اکثر فرمایشوں کی تعمیل سے انکار کرنا پڑا ۔ لیکن صرف انجمن حمایت اسلام لاہور کے لیے بعض وجوہات کے بنا پر اس کے سالانہ جلسوں میں نظمیں سناتے رہے۔اقبال کے دینی و فکری ارتقا کی بنیاد پر ان کی شاعری کو مختلف ادوار میں تقسیم بھی کیا گیا ہے ۔ چنانچہ مولانا عبدالسلا م ندوی اور طاہر فاروقی نے اقبال کی شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے ۔

۔ پہلا دور آپ کی شاعری کی ابتدا سے ۱۹۰۵ ء تک قرار دیا ہے۔
۔ دوسرا دور ۱۹۰۵ ء سے ۱۹۰۸ ء تک کا ہے ، یعنی آپ کے یورپ جانے سے واپسی تک کا دور ۔
۔ تیسرا دور ۱۹۰۸ ء سے لیکر ۱۹۲۴ ء تک یعنی بانگ درا کی اشاعت تک شمار کیا جاتا ہے ۔
۔ چوتھا دور ۱۹۲۴ ء سے لیکر آپ کی وفات تک کا ہے ۔

اقبال کی اہم شعری تصانیف اسرار خودی ، رموز بے خودی ، پیام مشرق ، بانگ درا ، بال جبریل ،ضرب کلیم اور ارمغان حجاز ہیں ۔ ان کی کتابوں پر الگ الگ گفتگو نہ تو یہاں ممکن ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت۔

:سیاسی زندگی

اقبال سیاسی زندگی سے دور ہی رہنا چاہتے تھے ،لیکن احباب کی خواہش کی وجہ سے اقبال نے ۱۹۲۶ ء میں سیاست میں قدم رکھا۔ لاہور کے حلقہ انتخاب سے کونسل کی ممبری کے لئے بطور امیدوار کھڑے ہوئے اور بہت ہی آسانی سے انتخاب میں کامیاب بھی ہوئے ۔ لیکن چار سال کے اندر ہی انہوں نے اپنی قابلیت سے اس قدر شہرت حاصل کی کہ دسمبر ۱۹۳۰ ء میں مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد کے صدر منتخب کئے گئے۔ کچھ ہی دنوں بعد یعنی اگلے سال ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس اور ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرس میں شرکت کے لیے اقبال کو نامزد کیا گیا ۔ جس وجہ سے اقبال کو ملک کے مدبرین و مفکرین کے ساتھ ملنے کا موقع ملا ۔ اور ساتھ ہی انگلستان کے سیاست دانوں کے ساتھ تبادلہ خیال کا موقع نصیب ہوا۔

انگلستان سے واپسی میں اقبال نے کئی ملکوں کی سیر کی اور کئی بڑی ہستیوں سے اقبال کی ملاقات بھی ہوئی۔چنانچہ فرانس میں اقبال کی ملاقات مشہور فلسفی برگسان سے ہوئی ۔ کہا جاتا ہے کہ اقبال نے انہیں یہ حدیث سنائی ’’زمانہ کو برا مت کہو کہ زمانہ خود خدا ہے ‘‘ اس حدیث کو سن کر برگسان اچھل پڑے ۔ پھر اقبال جب روم پہنچے تو ان کی ملاقات مسولینی سے ہوئی ۔ اقبال مسولینی کے حسن واخلاق سے بہت متاثر ہوئے ۔ مسولینی بھی اقبال کے خیالات سے بہت متاثر تھے کیونکہ انہوننے اقبال کی مثنوی اسرار خودی کا مطالعہ کیا ہوا تھا ۔ مسولینی نے اقبال سے درخواست کی کہ وہ اٹلی کے نوجوانوں کو کچھ نصیحت کریں تو اقبال نے کہا کہ ’’ اطالیہ ابی ایک نوجوان قوم ہے اور اگر وہ صحیح راہ اختیار کرنا چاہتی ہے تو اسے مغرب کی زوال آمادہ تہذیب سے منھ موڑ کر مشرق کی روحانی زندگی بخش تہذیب کی طرف توجہ کرنی چاہیے‘‘

علامہ اقبال اٹلی کے نوجوانوں کے جوش و عم سے بہت متاثرتھے ۔ ان کے متعلق آپ کے جذبات کا اندازہ آپ کی نظم ’’مسولینی ‘‘ سے لگایا جاسکتا ہے ۔

اقبال کے سفر یوروپ کی سب سے اہم بات اسپین کا سفر ہ آپ کا اسپین میں چند روزہ قیام بڑا ہی دلچسپ ہے ۔ اقبال جب اسپین پہنچے تو جس ہوٹل میں آپ کو قیام کرنا تھا اسکے مینجر سے آپ نے پوچھا کہ یہا قدیم مراکشی نسل کے لوگ آباد ہیں؟ جس پر مینجر نے کہا کہ ’’ میں خود مراکشی اصل ہوں‘‘

اقبال کو قدیم مراکشوں سے ملنے کی خواہش اس لیے تھی کہ آپ اسپین میں فاتحین عرب کا آثار دیکھنا چاہتے تھے ۔ اسپین کے سفر میں آپ کی ملاقات پروفیسر آسین سے بھی ہوئی ۔ اسپین کے سفر نے اقبال کے دل پر گہرا اثرکیا اور پرانی یادیں تازہ ہو گئیں تو اقبال نے کہا ۔

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں
بوئے یمن آج بھی اس کے ہوائوں میں ہے
رنگ حجاز آج بھی اس کی فضائوں میں ہے

Q.NO.04

داستان اور ناول کے برعکس افسانہ جدید صنعتی اور مشینی دور کی پیداوار ہے۔ اس دور کے انسان کو تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے کا ساتھ دینے اور زندگی کے نت نئے مسائل سلجھانے کے لئے شب و روز مصروف رہنا پڑتا ہے۔ اس مشینی دور کی تھکادینے والی تیز اور مصروف زندگی میں اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں کہ نچنت ہو کر فراغت سے بیٹھے اور بھاری بھرکم داستانوں اور ضخیم قسم کے ناولوں کا مطالعہ کرکے جذباتی تسکین یا ذہنی تفریح کا سامان کرسکے۔ چنانچہ وقت کی کم دامنی کا یہ احساس ہی مختصر افسانے کی ایجاد کا باعث بنا۔

:افسانے کی تعریف بیان کرتے ہوئے ایک نقاد نے کہا ہے کہ

افسانہ ایک ایسی نثری داستان کو کہتے ہیں جس کے پڑھنے میں کم از کم آدھا اور زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے لگیں۔

:اس سلسلے میں ایک اور نقاد کا کہنا ہے کہ

افسانہ ایک ایسی فکری داستان کو کہتے ہیں جس میں ایک خاص کردار، ایک خاص واقعہ، ایک تجربے یا ایک تاثر کی وضاحت کی گئی ہو۔ نیز اس کے پلاٹ کی تفصیل اس قدر منظم طریقے سے بیان کی گئی ہو کہ اس سے تاثر کی وحدت نمایاں ہو۔

افسانے کی بدلتی ہوئی قدروں کے پیشِ نظر یہ تعریف اتنی جامع نہ ہوتے ہوئے بھی کافی حد تک

صحیح ہے۔ اردو کا موجودہ افسانہ دراصل داستان اور ناول کی ترقی یافتہ صورت ہے، جس کے کے کا لفظ مستعمل ہے۔ اس صنف نثر کی موجودہ ادبی اور فنی روایت Short Story لئے انگریزی میں پر انگریزی افسانے کی گہری چھاپ نمایاں ہے۔ اپنی مخصوص روایت کے اعتبار سے افسانہ، داستان اور ناول سے مختلف صنف ہے۔ ذیل میں اس کی چند امتیازی خصوصیات بیان کی گئی ہیں:

اردو افسانے کی امتیازی خصوصیات

محدودیت

افسانہ نگار انسانی زندگی کے صرف ایک گوشے کی جھلک دکھاتا ہے۔ اس کی توجہ زندگی کے صرف ایک پہلو پر مرکوز رہتی ہے۔ وہ اس ایک پہلو مختلف گوشوں کی وضاحت کرکے کہانی مکمل کرتا ہے لیکن یہ سب گوشے ایک جمالیاتی توازن کے ساتھ آپس میں مربوط ہونے چاہئیں تاکہ افسانے میں تاثر کی وحدت قائم رہے۔ اگر افسانہ نگار افسانے میں زندگی کے ایک سے زیادہ پہلوؤں کو دکھانے کی کوشش کرے گا تو اس سے نہ صرف وحدت تاثر مجروح ہوگی بلکہ پلاٹ میں کئی قسم کی فنی خرابیاں بھی پیدا ہوجائیں گی۔

اختصار

اختصار افسانے کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ افسانہ نگار کو اس اختصار میں جامعیت پیدا کرنے کے لئے اشارے اور کنائے کی زبان استعمال کرنی پڑتی ہے۔ ان اشاروں پر غور کرنے سے زندگی کے مسائل پر سوچ بچار کرنے کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔

وحدتِ زمان و مکان

اتحاد زمان و مکاں بھی مختصر افسانے کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ افسانے کے واقعات اور وقت میں مطابقت ہو۔ واقعات اور وقت میں عدم مطابقت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ افسانہ تضاد کاشکار ہوجائے گا۔

وحدتِ کردار

عمل کی مطابقت بھی افسانے کی ایک بہت بڑی خوبی ہے۔ ایک ہی کردار سے مختلف موقعوں پر

متضاد قسم کے اعمال کا ظاہر ہونا بھی خلاف فطرت ہے۔ ایک ایسا کردار جس کی فطرت نیکی ہے، ایک وقت میں رحمدل اور دوسرے وقت میں ظالم نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح بدفطرت اور گھٹیا قسم کے کردار سے ایک وقت میں برائی اور دوسرے وقت میں نیکی ظاہر نہیں ہوسکتی۔ گویا افسانے کے کرداروں کے افعال میں ان کی فطرت کے مطابق یکسانیت ہونی چاہئے۔

موضوع کی عمدگی

افسانہ نگار کو موضود کے انتخاب میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ افسانے کا موضوع نیچرل، زندہ اور جاندار ہونا چاہئے تاکہ افسانہ نگار کو کہانی کے پلاٹ میں گردوپیش کے احوال اور معاشرتی مسائل کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرنے کا موقع مل سکے۔

دلچسپی کا عنصر

دلچسپی ایک کامیاب افسانے کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اگر افسانے کے موضوع اور پلاٹ کی دلچسپی کے ساتھ اسلوب بیان بھی موثر اور دلچسپ ہو تو کہانی کے اخلاقی اور تعمیری پہلو میں بھی شروع سے آخر تک ایک خاص قسم کی دلکشی قائم رہتی ہے۔

مربوط انداز

افسانے کی ایک نمایاں خصوصیت ربط ہے۔ افسانے کے واقعات کا آپس میں زنجیر کی کڑیوں کی طرح مربوط اور منسلک ہونا ضروری ہے۔ یہ ربط بڑے فطری انداز میں نمایاں ہونا چاہئے۔

مشاہدے کا عنصر

مشاہدے کی گہرائی، انسانی نفسیات کا عمیق مطالعہ اور حقائق اشیاءمیں اتر جانے والی نگاہ نیز متوازن اور مرتب انداز فکر، افسانہ نگار کا قیمتی سرمایہ ہے۔

نظم و ضبط

افسانے کے پلاٹ میں نظم و ضبط اور موزوں ترتیب کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر افسانے کے واقعات اور کرداروں میں ایک متوازن ربط موجود ہو تو اسے منظم پلاٹ کہا جائے گا۔ کہانی کے واقعات اگر ربط اور ترتیب سے خالی ہوں تو ایسے پلاٹ کو غیر منظم پلاٹ کہا جائے گا۔ اگر افسانے میں ایک

مرکزی کہانی کے ساتھ چند اور قصے بھی ایک خاص توازن اور ترتیب کے ساتھ مربوط ہوں تو اس قسم کے پلاٹ کو مرکب پلاٹ کہیں گے۔

کردارنگاری

ایک کامیاب افسانے میں کردار نگاری کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ افسانے کے کرداروں کو ہمارے گردوپیش چلتے پھرتے انسانوں کی خصوصیات اور اخلاق و عادات کا حامل ہونا چاہئے۔ اگر کردار مصنوعی ہوں گے توقاری کو متاثر نہیں کرسکیں گے۔ ایک کردار کو بلاوجہ مثالی کردار دکھانا اور دوسرے کو بلاسبب اخلاق کی پستیوں میں دھکیل دینا بھی افسانے کی ایک بہت بڑی خامی ہے۔ جس طرح عام انسان عادات و اطوار میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیناسی طرح افسانے کے کرداروں میں بھی یکسانیت نہیں ہونی چاہئے۔ مثال کے طور پر ناپختہ نوجوانوں، پختہ کار اور جہاندیدہ بوڑھوں، عورتوں اور بچوں میں ان کی فطرت اور نفسیات کے اعتبار سے فرق دکھانا چاہئے۔

افسانے کا مثالی کردار بڑا معیاری اور عام انسانوں سے بلند ہونا چاہئے لیکن اسے اس قسم کے غیر فطری اور ماورائی اوصاف سے بھی متصف نہیں دکھانا چاہئے کہ وہ ایک مافوق الفطرت انسان بن کر رہ جائے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ افسانے کی کامیابی کا دارومدار بالعموم مثالی کرداروں کی کامیاب کردار نگاری پر ہوتا ہے مگر چند ایسے ذیلی کردار جو افسانے کو اختتام تک پہنچانے میں مدد دیتے ہیں ان کی اہمیت بھی اپنی جگہ کچھ کم نہیں۔

منظرکشی

حالات و اقعات کی کامیاب منظر کشی افسانے کی بہت بڑی خصوصیت ہے۔ افسانہ نگار کو چاہئے کہ یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے افسانے کا پلاٹ مقامی ماحول سے مرتب کرے تاکہ واقعات کی تصویر کشی میں اس سے کوئی فروگزاشت نہ ہوجائے۔ بعض اوقات افسانے میں غیر ملکی ماحول کی عکاسی کرنا پڑتی ہے۔ اس مقصد کے لئے افسانہ نگار کو متعلقہ ملک کے باشندوں کی معاشرت، عادات و خصائل اور جغرافیائی ماحول سے پوری طرح باخبر ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس غرض کے لئے دوسرے ملکوں کی تہذیب و معاشرت اور جغرافیائی حالات کا مطالعہ از بس لازم ہے۔ اس سلسلے میں غیر ممالک کے لوگوں سے میل جول کے مواقع پیدا کرتے رہنا بھی مفید ہوسکتا ہے۔

مقصدیت

ادب برائے زندگی کے مصداق افسانے کا مقصد بہر صورت تعمیری ہونا چاہئے۔ اچھا فنکار وہ ہے جو اپنے قلم کو مقدس امانت سمجھے، اسے صحت مند معاشرتی اصلاح کے لئے وقف رکھے، اور موقع بموقع ملک کے سیاسی، سماجی، اخلاقی، معاشی اور تعلیمی مسائل پر رائے زنی کرتا رہے۔

افسانے کے مراحل اور اجزاہ

افسانے کے ظاہری اور معنوی خدوخال کی تریب، تشکیل اور تہذیب کے لئے افسانہ نگار کو بالعموم ذیل کے فکر مراحل میں سے گزرنا پڑتا ہے۔

موضوع کا انتخاب

زندگی ان گنت موضوعات میں بٹی ہوئی ہے اس لئے افسانے کے موضوعات بھی بے شمار ہیں۔ اگر افسانہ نگار کو قدرت کی طرف سے دل بیدار اور دیدئہ بینا عطا ہوا ہو تو موضوع کا انتخاب کوئی مشکل بات نہیں۔ یہ موضوع مناظر قدرت، جاندار اشیاہ، حیات انسانی کے مختلف جذباتی پہلووں، اس کی سماجی، سیاسی، اقتصادی اور تمدنی زندگی کے مختلف گوشوں سے اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ افسانہ نگار کو صرف وہی موضوع انتخاب کرنے چاہئیں جو اس کی افتاد طبع کے مطابق ہوں یا جن سے انہیں طبعی لگاو اور ذاتی دلچسپی ہو۔

عنوان

بعض اوقات افسانے کا عنوان ہیرو یا ہیروئن کے نام پر رکھا جاتا ہے۔ افسانے کے انجام کو بھی ایک حسین ترکیب کی صورت میں زیب عنوان بنالیا جاتا ہے۔ بعض دفعہ افسانے کی سرخی قائم کرتے ہوئے موسم یا وقت کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ کبھی پلاٹ کی مناسبت سے کسی شعر کے ایک مصرعے یا مصرعے کے ایک ٹکڑے کو بھی بطور عنوان کے لکھ دیا جاتا ہے۔ بعض دفعہ افسانے کے مجموعی تاثر کو ذہن میں رکھ کر عنوان قائم کردیا جاتا ہے۔

تمہید

افسانے کے تمہیدی جملوں میں جادو کا اثر ہونا چاہئے تاکہ قاری ان ابتدائی جملوں سے پورے

افسانے کے بارے میں ایک گہرا تاثر قبول کرے اور پورا افسانہ پڑھنے کے لئے مضطرب ہوجائے۔ بعض اوقات افسانے کا آغاز کہانی کے کسی آخری یا درمیانی واقعہ سے کیا جاتا ہے۔ اس سے قاری میں تجسس کا جذبہ ابھرتا ہے۔ کسی مؤثر کردار کے تعارف سے بھی افسانے کا آغاز ہوسکتا ہے۔ کسی دلچسپ اور موثر مکالمے کو بھی افسانے کی تمہید بنایا جاسکتا ہے۔ ہر نوع افسانے کی تمہید ایسی موثر، جاندار اور مسحور کن ہونی چاہئے جسے پڑھ کر قاری کی آتش شوق بھڑک اٹھے۔

پلاٹ

افسانہ نگار خام مواد کو ترتیب دینے کے لئے واقعات کے ربط و تعلق کے مطابق کہانی کا جو ڈھانچہ تیار کرتا ہے اسے پلاٹ کہتے ہیں۔ افسانے کا پلاٹ ایسے احوال و واقعات اور تجربات سے مرتب کرنا چاہئے جو ہماری زندگی میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ زندگی کے روز مرہ واقعات میں کہانی کا چٹخارا اور جذباتی رنگ بھرنے کے لئے افسانہ نگاروں کو عبارت آرائی اور تصنع سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ ورنہ افسانے اور سپاٹ قسم کی واقعہ نگاری میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔

مکالمے

افسانے کے مکالموں کا لب ولہجہ سادہ، فطری، برجستہ اور شگفتہ ہونا چاہئے۔ خوشی، غم، حیرت یا غیظ و غضب کے موقعوں پر لہجے کے آہنگ میں موقع و محل کے مطابق فرق کرنا لازم ہے۔ بچوں کا لہجہ معصوم اور سادہ، مردوں کا لہجہ موقع محل کے اعتبار سے جاندار، پختہ سنجیدہ اور بعض اوقات درشت، مگر تدبر آمیز، عورتوں کا لہجہ عام طور پر نرم و ملائم، اور شفقت آمیز ہونا چاہئے۔ افسانے میں باوقار سنجیدگی کی فضا کو قائم رکھنے کے لئے مکالموں میں تہذیب اور شائستگی کا پہلو نمایاں رکھنا چاہئے۔ کرداروں کا بازاری قسم کے متبذل اور غیر شریفانہ لب و لہجے سے مجتنب رہنا ضروری ہے۔ ایسی ظرافت جو ابتذال کی حدوں سے دور رہے، افسانے کو ناگوار قسم کی سنجیدگی سے محفوظ رکھتی ہے۔

کشمکش (Crisis)

افسانے میں ایک منزل ایسی بھی آتی ہے جب کہانی بعض پیچیدہ مسائل کے گرد گھومتی ہے۔ اس منزل میں افسانہ نگار کو کرداروں کی سیرت کے صحیح خدوخال نمایاں کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کہتے ہیں۔ (Crisis) پیچیدہ مقام کو افسانے کی اصطلاح میں کشمکش

(Climax) نقطۂ عروج

کی فضا میں پہنچ جاتے (Climax) کشمکش کی منزل سے گزر کر کہانی کے واقعات نقطۂ عروج ہیں اور قاری اس سوچ میں پڑجاتا ہے کہ نہ جانے اب کیا ہوگا۔ اس موقع پر انجام بالکل غیر یقینی سا ہوتا ہے، اس لئے وہ بڑی بیتابی سے کسی فیصلہ کن موڑ کا منتظر ہوتا ہے۔

اختتامِ افسانہ

افسانے کے اختتام پر کشمکش اور تصادم کی فضا آہستہ آہستہ ختم ہوجاتی ہے اور افسانہ قاری کے ذہن پر کوئی طربیہ، حزنیہ یا حیران کن اضطرابی کیفیت چھوڑ کر اپنے انجام کو پہنچ جاا ہے۔ افسانے کا انجام کچھ ایسا فطری انداز میں ہونا چاہئے کہ قارئین کے دل یہ محسوس کریں کہ کہانی کا یہ انجام بڑا مناسب اور برمحل ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور انجام ممکن ہی نہیں تھا۔

Q.NO.05

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے
زبان پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے

فیض احمد فیض بیسویں صدی کے اُن خوش قسمت شعراء میں شمار ہوتے ہیں جنہیں اپنی زندگی میں بے پناہ شہرت و مقبولیت اور عظمت ملی ، انہوں نے دارورسن کا مزہ بھی چکھا اور کوچہ یار کی رنگینیوں اور دلکشیوں سے بھی لطف اندوز ہوئے۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

چشم نم ، جان شورید کافی نہیں
تہمت عشق پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پا بجولاں چلو
دست افشاں چلو مست و رقصاں چلو
خاک برسر چلو ، خوں بداماں چلو

راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو

فیض شاعری میں ایک نئی روایت کے علمبردار وہ ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے ہیں مگر ان کے ہاں دیگر ترقی پسندوں کی طرح تلخی نہیں ہے۔ انہوں نے مروجہ الفاظ کو نہایت فنکارانہ انداز میں معنی عطا کیے اور غزل کی معروف روایات کو اپنے نصب العین کے مفاہیم کے ساتھ بیان کیا۔

:نمونہ کلام ملاحظہ ہو

تم آئے ہو ، نہ شبِ انتظار گزُری ہے
تلاش میں ہے سحر ، بار بار گزری ہے
وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

فیض کی شاعری کی چند نمایا ں خصوصیات کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

-:ترقی پسندی

فیض ترقی پسندوں کے امام تصور کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے نہایت خلوص اور فنکاری کے ساتھ اور اپنے نظریات اور رجحانات کو شعر میں ادا کیا۔ ترقی پسندی شعرو ادب میں ایک نئی روایت ہے کہ جسے انہوں نے خوبی کے ساتھ اپنایا ، انہوں نے مزدور ، محنت کش، کسان اور دوسرے طبقات کے دکھ درد کی سچی ترجمانی کی۔ فیض کا فنکارانہ کمال یہ ہے کہ انہوں نے مروجہ شعری ڈھانچے سے فکرو خیال کی نئی عمارت کھڑی کی۔

:نمونہ کلام ملاحظہ ہو

اے خاک نشینوں اُٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اُچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں ، تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے
ابھی چراغ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
اب گرانی شب میں کوئی کمی نہیں آئی
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہی آئی

-:رومانیت

فیض کے ہاں انقلاب آفریں رومانویت پائی جاتی ہے فیض کے ہاں آدرش پایا جاتا ہے اور یہ آدرش وہ معاشرے میں دیکھنا چاہتے ہیں اور اسکے حسن کے گیت گاتے ہیں۔

:نمونہ کلام ملاحظہ ہو

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب تھے غم روزگار کے
بُجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی

<u>-:سماجی مساوات</u>

سماجی انصاف اور مساوات کلام فیض کا اہم موضوع ہے۔ معاشرے میں غریب اور مزدور طبقے کا جس انداز میں استحصال کیا جاتا ہے اس کی بازگشت فیض کے کلام میں سنی جاسکتی ہے ۔ سماجی اور اقتصادی عدم مساوات سے معاشرے میں ان گنت مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ فیض ان تمام موضوعات کو شاعرانہ حسن کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

:نمونہ کلاملاحظہ ہو

ان دہکتے ہوئے شہروں کی فراداں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے
یہ حسیں کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لئے ان میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے

<u>-:غزل گوئی</u>

غزل کا مزاج عموماًعاشقانہ ہے جس میں درد و غم اور سوزو گداز اسکی بنیادی صفات ہیں ۔ فیض کی غزل ایک منفرد روایت کی حامل ہے۔ فیض نے اپنے آئیڈیل سماجی انصاف کو اپنا محبوب بنایا ہے۔ اس طرح فیض نے غزل کی معروف روایات کو معاشرتی اور سماجی انصاف سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا ہے۔ اور یہی فیض کا شاعرانہ آرٹ ہے۔

:نمونہ کلام ملاحظہ ہو

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے چمن میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوف خدا گیا
وہ پڑی ہیں روزِ قیامتیں کہ خیال روزِ جزا گیا

روزِ الفت چھپا کے دیکھ لیا
دل بہت کچھ جلا کے دیکھ لیا
اور کیا دیکھنے کو باقی ہے
آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا
فیض تکمیل غم بھی ہو نہ سکی
عشق کو آزما کے دیکھ لیا

-:نظم نگاری

فیض نے شاعری کی ابتداء غزل کی لیکن آہستہ آہستہ نظم کی طرف متوجہ ہوتے گئے ۔ فیض کو دونوں اصناف پر قدرت حاصل ہے ۔ مجموعی طور پر فیض کے کلام کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے دور کو ہم رومانی کہہ سکتے ہیں اس دور کی نظموں میں فیض نے خیالی دنیا بسائی ہے جس میں وہ غم دوراں کی تلخیوں سے فرار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

دوسرا دور وہ ہے جس میں وہ زندگی کا کافی مشاہدہ کیے ہوئے محسوس ہوتے ہیں ۔ یہاں وہ عشق کی منزل کی طرف رواں دواں نظر آتے ہیں۔ اور دور میں "نقش فریادی"کے آخری کلام سے "دست صبا" کا کلام شامل کیا جاسکتا ہے۔

:نمونہ کلام ملاحظہ ہو

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ
میں نے سمجھا تھا کہ تُو ہے تو ،درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟

فیض کی ایک خوبصورت نظم "بہار آئی" سے اشعار ملاحظہ ہوں۔

بہار آئی تو جیسے یک بار
لوٹ آئے ہیں پھر عدم سے
وہ خواب سارے، شباب سارے

جو تیرے ہونٹوں پہ مرمٹے تھے
جو مٹ کے ہر بار پھر جئے تھے
نکھر گئے ہیں گلاب سارے
جو تیری یادوں سے مشکبو ہیں
جو تیرے عشاق کا لہو ہیں
اُبل پڑے ہیں عذاب سارے
ملالِ احوال دوستاں بھی
خمار آغوشِ مہ و شاں بھی
غُبار خاطر کے باب سارے
ترے ہمارے
سوال سارے جواب سارے
بہا ر آئی تو کھل گئے ہیں
نئے سرے سے حساب سارے

-:عام فہم علامتیں

فیض کے ہاں علامتوں کے مفاہم کی تلاش پیچیدہ نہیں اسی لئے وہ عام قاری کے فہم سے قریب ہیں۔ انہوں نے ظلمت اور سحر جیسی علامتیں اپنے اظہار کے لئے اختیار کی ہیں۔ جن کا مفہوم قدیم جبر کا نظام اور جدید امن دوستی اور انسان دوستی کا نظام ہے۔

:نمونہ کلام ملاحظہ ہو

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا ، یہ وہ سَحَر تو نہیں
یہ سحر وہ تو نہیں ،جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

-:جمالیات

فیض کی شاعری میں جمالیاتی پہلو بہت نمایاں ہے ان کی بحریں مترنم الفاظ سبک شیریں اور شعری تمثلیں رنگین اور حسین ہیں ۔ ان کے ہاں ایک خواب ناک فضا ملتی ہے۔

:کلام ملاحظہ ہو

اُن کا آنچل ہے کہ رُخسار کا پیرہن ہے

کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں

-:لفظی پیکر تراشی

فیض شاعری کے جدید اصولوں اور انداز سے واقفیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ جدید شاعری میں لفظی پیکر تراشی اور افکار کی تجسیم ایک اہم رجحان ہے۔ اُردو شاعری میں اس خصوصیت کے خوبصورت نمونے فیض کی شاعری میں ملتے ہیں۔

:نمونہ کلام ملاحظہ ہو

سورہی ہے گھنے درختوں پر

چاندنی کی تھکی ہوئی آواز

-:فیض ناقدین کی نظر میں

:معروف نقاد پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں

فیض کی شاعری میں انگریزی ادب کے ایک خوشگوار اثر جدید انسان کے ذہن اور ایشیائی تہذیب کے قابل قدر عناصر کی ایک قوس و قزح جلوہ گر ہے۔

-:مشہور اسکالر اور ادیب ڈاکٹر جمیل جابی کیا خیال ہے کہ

فیض کی سب سے نمایاں خصوصیات ان کے خیالات کی سنجیدگی شخصیت کا توازن اور شعری " اعتدال ہے۔

کورس: پاکستانی زبانیں اور ادب۔I (4657)

سمسٹر: خزاں 2019ء

امتحانی مشق نمبر 2

(یونٹ: 5 تا 9)

کل نمبر: 100

کامیابی کے نمبر 40

سوال نمبر۔ سندھی ادب میں نثر و نظم کے جداجدار جحانات پر نوٹ تحریر کریں۔ (20)

سوال نمبر 2۔ براہوی زبان کی ابتدا کس طرح سے ہوئی؟ نیز براہوی نثر کے ارتقائی مراحل تفصیل سے بیان کریں۔ (20)

سوال نمبر 3۔ بلوچی شاعری پر تفصیلی نوٹ تحریر کریں۔ (20)

سوال نمبر 4۔ تحریک آزادی نے سندھی ادب پر کس طرح کے اثرات مرتب کیے آزادی کے بعد سندھی افسانے اور ڈرامے میں کس قسم کی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ تفصیل سے تحریر کریں۔ (20)

سوال نمبر 5۔ بلوچی زبان کے آغاز اور ارتقا کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں۔ نیز بلوچی ادب کے مختلف ادوار کی نشاندھی کریں؟ (20)

Q.NO.01

سندھی زبان 25 ملین لوگوں کی مادری زبان ہے جو سندھ اور کچ میں کثرت سے بولی، سمجھی اور لکھی جاتی ہے۔ سندھ پشتو زبان کے سین سے نکلا ہے جو دریا کو کہا جاتا ہے اور سندھی کا مطلب ہے دریائے سندھ کے کنارے آباد لوگ لیکن یہاں اس سے مراد صوبہ سندھ کے رہنے والے لوگ ہیں حالانکہ دریائے سندھ کو اہل سندھ خود مہران کہتے ہیں۔ زرتشت کی مذہبی کتاب میں دریائے سندھ کا نام مہرا ہے جو بعد میں مہران کہلایا۔ سندھی زبان صوبہ سندھ کی سرکار ی زبان ہے جبکہ ہندوستان کے کسی بھی صوبے کی یہ سرکاری زبان نہیں ہے۔ اس زبان کی حدود کاٹھیاواڑ سے لیکر بہاولپور تک اور بروہیوں کے پہاڑ سے لیکر ہندوستان کے مغربی ریگستان تک ہیں۔ پاکستان کی تخلیق سے پہلے صوبہ سندھ کی قومی زبان سندھی تھی۔ سندھ پر قبضہ کے بعد بمبئی پریزیڈنسی نے 1868ء کو سندھی کو ابجد (عربک پرشن سکرپٹ) سے خدادادی سکرپٹ پر تبدیل کیا تو مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہواجس کے بعد برٹش راج نے بمبئی پریزیڈنسی کے ذریعے مارشل لاء نافذ کیا۔ جب انگریزوں نے سندھ کو فتح کیا توگورنر سر جارج کلرک نے 1848ء مینسندھی زبان کو سندھ کی سرکاری زبان قرار دیا ۔1857ء کو کمشنر سندھ سر بارٹل نے سندھ میں سول سروسز کے لئے سندھی زبان کو پاس کرنا

لازمی قرار دیا جن میں ریونیو، تعلیم اور پولیس کے محکمے سر فہرست تھے۔ آج بھی سندھ میں سندھی زبان سیکھنا اور لکھنا لازمی ہے چاہے تعلیمی ادارہ سر کار ی ہو یا پرائیویٹ جو میٹرک سسٹم نظام تعلیم کو فالو کرتا ہو جبکہ کیمرج سسٹم نظام تعلیم اس آرڈر سے مبرا ہے۔ سندھ میں ہر سرکاری ادارے کے نام کی تختی یعنی بورڈ پر سندھی لکھنا لازمی ہے ۔آزادی ہند کے بعد انڈیا حکومت نے اندرون ہند 1948ء میں تعلیمی اداروں میں سندھی کو دیوناگری رسم الخط میں لکھنا لازمی قرار دیا جس سے مسلمانوں میں سخت اشتعال بڑھا، اب دونوں طرز تحریر میں یعنی عربک، پرشیئن سٹائل میں بھی سندھی سیکھی جاسکتی ہے۔ ہندوستان کی تین ریاستوں میں جن میں گجرات، راجستھان اور مدھیا پردیش شامل ہیں، سندھی تیسرا بڑا اختیاری مضمون ہے۔ سندھی زبان کو ماہر لسانیات سنسکرت کے تال میل سے نکلتی زبان سمجھتے ہیں جوکہ بگڑی ہوئی پراکرت کی ایک بولی سمجھی جاتی ہے بلکہ اگر ہم اس کو سنسکرت کی بگڑی بولی کہیں تو زیادہ بہتر ہوگا بلکہ بعض ماہرین لسانیات کی رو سے سنسکرت سے بھی قبل وادی سندھ میں یہ بولی جانے والی قدیم زبان ہے۔ لہٰذا کشمیری اور دراوڑی زبانیں اس کی بہنیں ہیں لیکن ساخت اور تاریخ کی ارتقاء کے لحاظ سے یہ برصغیر کی دوسری ہند آریائی زبانوں سے نرالی ہے۔ اس لئے کہ دیگر زبانوں کی تشکیل اور نشو ونما میں انڈو ایرانی اور مغرب سے واصل ہونے والی دوسری زبانوں کو دخل ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری ہندوستانی لسانیت میں اسی خیال کے موید رہے ہیں کہ سندھی زبان کی بعض مخصوص صوتیات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ آوازیں ہندوستان کی دوسری زبان میں موجود نہیں خواہ وہ آریائی ہوں یا دراوڑی یا کول یا تبت چینی۔ ان کے خیال میں گ، ج ،ڈب کا خاص تلفظ وہ (یعنی سندھی) اس طرح کر تے ہیں کہ سانس نرخرے میں رک جاتی ہے۔ یعنی زبان کی ہئیت میں زمانے کی اتھل پتھل کے باوجود کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے ۔ بعض لوگوں کا خیا ل ہے کہ موہنجو دڑو والے بھی سندھی بولتے تھے۔ بعض کے نزدیک سندھی زبان کا تعلق سمیری اور عبرانی زبان سے ہے لیکن ڈاکٹر جی الانہ اس خیال کو رد کرتے ہیں۔ سندھی زبان کی جدید گرائمر، قواعد وضوابط کی ترتیب کا اعزاز پریسٹ واتھن اور اسٹوک انگریزوں کو حاصل ہے۔ جس طرح پشتو زبان میں انگریزوں نے بہت سا کام کیا ہے اسی طرح انگریزوں نے سندھی زبان میں بھی بہت زیادہ کام کیا ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی(1690-1752)؛ لطیف سند آ، سائیں سند لطیف آ،(یعنی لطیف سندھ ہے اور سندھ لطیف ہے)۔ لطیف کی شخصیت و شاعری اپنی ہمہ گیری، وسعت فکر اور جذبہ و احساس کی گہرائی کی بنیاد پر Greatest Poet of Sindh عالمی ادب کے معیار پر پورا اترتی ہے۔ دیا رام گڈومل نے اپنی کتاب میں شاہ کو سندھی کا حافظ شیرازی قرار دیا ہے۔ شاہ لطیف کے بعد شیخ آیاز (1923-1997) ہی ایک

ایسے شاعر ہیں جو اپنی زندگی میں ایک لیجنڈ بن گئے تھے۔ یاد رکھیناو جمالو ہم سندھی نغموں مینزیادہ سنتے ہیں، جمالو کوئی حسین لڑکی نہیں بلکہ یہ جمال ہے جو سندھ کا ایک بہادر بیٹا تھا اور اِفغان جنگجو حکمرانوں سے لڑتا تھا ۔ سندھی زبان پاکستان میں واحد ایک قومیتی زبان ہے جس میں برصغیر پاک وہندکی کیا ساری دنیا کی مشہور زبانوں سے کتابیں ترجمہ کی جاتی ہیں اور سندھی زبان سے ان میں کتابیں ترجمہ کی جاتی ہیں۔ سندھی زبان میں فارسی اور عربی زبان سے بھی بے شمار الفاظ جذب ہوتے جا رہے ہیں۔ پچاس سے زیادہ چھوٹے بڑے اخبارات شایع ہوتے ہیں اور بے شمار ٹی چینلز بھی ہیں جن میں کے ٹی این، آواز، سندھی ٹی وی، مہران ٹی وی، دھرتی ٹی وی اس کے علاوہ انڈین کے بھی ہیں۔ اور دوسری ہماری بے حسی کو دیکھیے کہ تعلیم یافتہ ہوکر بھی نہ پشتو لکھ سکتے ہیں اور نہ پڑھ سکتے ہیں حالانکہ ہم آبادی میں ان کے ڈبل سے بھی زیادہ ہیں کیونکہ ہم میں ''خپلہ ژبہ خپل ،خپل احساس'' کا احساس نہیں ہے۔ سندھی چودہ رسم الخطوں میں لکھی جاتی ہے جو مختلف علاقوں اور قبیلوں میں رائج ہیں جوکہ درجہ ذیل ہیں۔ خدادادی، شکارپوری، لوہانی، لاڑی، ونگائی، راجائی، خواجکو، میمنی، بھاٹیا، سوھانی،گرمکھی، جسے لنڈایا بھی کہتے ہیں، وانکائی اور دکھنی لھندا۔ اب پندرہواں رسم الخط بھی آگیا ہے جوکہ عام ہے یعنی عربوں کی آمد پر سندھی آہستہ آہستہ سندھی رسم الخط عربک۔پرشین سٹائل میں لکھی جانے لگی۔ سندھی کا عربک پر مشتمل ہے ۔ vowelsاور سولہ Consonant phonemesپرشین رسم الخط جس میں چھیالس سندھی زبان کے کئی لہجے ہیں لیکن چار بہت زیادہ مستعمل ہیں 1۔سرو یا سرائی لہجہ جو بالائی اور زیریں پنجاب میں بولا جاتاہے اور سندھی اور سرائیکی زبانوں کا مخلوط لہجہ ہے۔2۔ لاڑی لہجہ زیریں سندھ میں بولا جاتا ہے۔3۔کوہستانی، مغربی سندھ کا پورا علاقہ جو بلوچوں کا ہے، بلو چی زبان کے علاوہ وہ سندھی بھی بولتے ہیں، ان کا یہ جداگانہ سندھی لہجہ کوہستانی کہلاتا ہے ۔4۔ وچولی سندھی زبان کامعیاری لہجہ ہے جو جغرافیائی تقسیم اور محدودات سے بری الذمہ ہے دفتر، تعلیم، صحافت اور مذہبی امور کے لئے یہ لہجہ استعمال کیاجاتا ہے۔

مخدوم امین فہیم مرحوم کی سندھی غزل کی منظوم اردو صورت؛

ے نظر فریب نظاروں نے بھی دیے ہیں فریب
خزاں رسیدہ بہاروں نے بھی دیے ہیں فریب
رہا نہ کوئی جدائی میں مونس وغم خوار
سحرکے ڈوبتے تاروں نے بھی دیے ہیں
کس کو رسم تعلق کا ہے خیال کہاں

شکستہ دل کو سہاروں نے بھی دیے ہیں فریب
دکھاکے دل کو جو کرنے چلے ہیں دل داری
ہمیں تو اپنے ہی یاروں نے بھی دئیے ہیں فریب
غموں میں ہنستے رہے ہیں خوشی میں روتے ہیں
فریب خوردہ بہاروں نے بھی دیے ہیں فریب
متاع عشق سمجھتے تھے جن نگاہوں کو
انہیں کے شوخ اشاروں نے بھی دیے ہیں فریب

Q.NO.02

براہوی بہت قدیم زبان ہے مگر اس زبان کا پہلا تعارف پہلی افغان جنگ کے موقع پر میجر لیچ نے 1838ء میں اپنے سلسلہ مضامین سے کیا جو ''جنرل آف ایشیا ٹک سوسائٹی'' میں شائع ہوئے، ان مضامین نے علمی حلقوں میں ہلچل پیدا کر دی ، ان مضامین سے متاثر ہو کر جرمن ، اطالوی اور فرانسیسی ماہرین لسانیات، براہوی اور بلوچی زبانوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ آخر 1880ء میں جرمنی کے ماہر لسانیات ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ نے براہوی کی گریمر اور فرہنگ کے تقابلی مطالعے کے بعد اسے شمالی ہند میں بولی جانے والی ایک منفرد قدیم دراوڑی زبان قرار دیا۔ عہد حاضر کے محققین نے بھی اس کی تائید کی ہے جن میں کیلی فورنیا یونیورسٹی کے ڈاکٹر ایمینو اور میک گل یونیورسٹی (کینیڈا) کے ڈاکٹر عبدالرحمن بارکر بھی شامل ہیں۔ اس زبان کی تاریخ قدیم ہے مگر تحریری ادب کا نمونہ ''تحفتہ العجائب'' ہے جس کا مصنف ملک داد قلاتی میر نصیر خان اول (1750ء ، 1793) کے درمیان میں دربار قلات سے وابستہ رہ چکا تھا اس میں 1257اشعار ہیں۔ براہوی کا تحریری ادب مولانا محمد فاضل درخانی کی کاوشوں کا مرہون منت ہے۔ آپ کے قائم کردہ دینی مدرسے سے آپ کے شاگردوں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہوئی جس نے اسلام کی خدمت کے ساتھ ساتھ براہوی کو بھی ایک تحریری زبان بنا دیا۔ ان میں بنو جان ، مولانا عبدالمجید، مولانا عبدالحئی اور علامہ محمد عمر دین پوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولانا محمد عمر دین پوری کا سب سے بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کا براہوی میں ترجمہ کیا پھر ''احوال'' نکلنے لگا، براہوی اکیڈمی کے علاوہ اور کئی انجمنیں مثلاً براہوی ادبی سوسائٹی کوئٹہ ، براہوی آرٹس اکیڈمی کوئٹہ ، براہوی ادبی سنگت جیکب آباد، براہوی اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن سندھ یونیورسٹی جام شورو، آل پاکستان براہوی ایسوسی ایشن لاڑکانہ اس زبان کے فروغ کے لئے مصروف عمل تھیں۔قیام پاکستان کے بعد

ماہنامہ ''معلم'' سریاب کوئٹہ ، ہفت روزہ ''نوائے وطن'' کوئٹہ اور ''نوائے بولان'' مستونگ میں براہوی شاعروں اور ادیبوں کے تعارف کا سلسلہ شروع ہوا۔ 4 نومبر 1959ء کو کوئٹہ میں ''براہوی ادبی بورڈ'' کی تشکیل کی گئی جس کے پہلے صدر نواب غوث بخش رئیسانی قرار پائے۔یہ بھی حقیقت ہے کہ براہوی قدیم زبان ہے اور براہوی بولنے والے میر آف قلات کا اس خطے میں راج رہامگر اس نے بھی اپنے دربار میں براہوی کی بجائے فارسی کا استعمال کیا،براہوی زبان سرکاری سرپرستی سے مسلسل محروم چلی آ رہی ہے اس پر توجہ کی ضرورت ہے کہ یہ ملک و قوم کا اثاثہ اور سرمایہ ہے۔ براہوی کے مقابلے میں بلوچی زبان کو اہمیت اور سرپرستی حاصل رہی ہے ،بلوچی ماضی قریب میں فارسی کہلائی جاتی ،آج زبان ہے ، آج اس حقیقت کو تسلیم کیا جانا چاہئے مگر یہ بھی ہے کہ بلوچ تاریخ کے حوالے سے مستند تحقیق اور ریسرچ کی ضرورت ہے ، لفظ بلوچ فارسی کے بعلوث اور عربی کے بلوش سے اخذ ہوا ہے ۔تاریخی حقیقت یہ ہے کہ موجودہ بلوچستان کے علاقے میں باہر سے آنے والے ہر خانہ بدوش کو بلوچ کہا گیا چاہے اس کی ذات یا قومیت کوئی بھی تھی ، ایک واقعہ یہ ہوا کہ انگریز دور میں رابرٹ سنڈے مین نے اپنے مقاصد کیلئے ''تورا '' کا مقامی قانون بنایا جسے بعد ازاں بلوچ قانون کا نام بھی دیا گیااس قانون کے تحت عورت کا وراثت میں حصہ ختم، کالی کا قتل جائز، عورت کی نیلامی وغیرہ شامل تھے۔ رابرٹ نے یہ قانون پاس کیا کہ کوئی بھی شخص درخواست دے کر بلوچ بن سکتا ہے جس کے بعد ہر اس شخص نے بلوچ بننے کی درخواست دی جس نے عورت کو وراثت سے محروم کیا، البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ سابق صدر فاروق خان لغاری کے والد جمال خان لغاری پہلے تمندار تھے جنہوں نے 1921ء میں اس قانون کے خلاف بغاوت کی اور اسے شریعت کے منافی قرار دیا۔ سولہویں صدی عیسوی میں ایران سے بلوچوں کی آمد سے پہلے نہ تو یہاں کوئی بلوچ رہتا تھا اور نہ اس علاقے کا نام بلوچستان تھا، البتہ براہوی اس خطے کی قدیم قوم ہے، تاریخی حقیقت یہ ہے کہ موجودہ بلوچستان کے علاقے مختلف حکومتوں کے زیر تسلط رہے، (529-577) مسامسانی نوشیرواں عادل ، 636ء میں راجہ چچ سندھ ، 643ء عربوں کی حکومت قائم ہوئی ، آل غزنوی اور آل غوری کے بعد یہ علاقہ 1219ء میں سلطان محمد خان والی خوارزم کے زیر قبضہ آ گیا، پندرہویں صدی میں ارفون آیا جسے بابر نے شکست دیکر بھگایا، 1556ء عیسوی میں یہ علاقہ ایران کے زیر تسلط آیا، اس دوران ایرانی حکومت نے بلوچستان سے موجودہ بلوچ جو کہ اس وقت بعلوث یا بلوش کہلاتے تھے کو ناراضگی کی بناء پر اس علاقے میں دکھیلا، کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے میر جلال خاں اور بعد میں دوسرے بھیجے گئے، اس علاقے میں لفظ بعلوث او ربلوش سے بگڑ کر بلوچ ہو گیا، ان کی بنیادی زبان فارسی تھی جو کہ

بعض مقامی الفاظ کی آمیزش سے اب بلوچی کہلاتی ہے، اس کے مقابلے میں اس خطے کی اصل زبان براہوی جو کہ بلوچی سے قطعی طور پر مختلف ہے اور اس کی تاریخ ہزاروں سالوں پر محیط ہے، یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مؤرخین کے درمیان ایران سے آنے والے بلوچ کی اصلیت عربی یا فارسی کے مسئلے پر اختلاف موجود ہے ، البتہ اس بات پر سب متفق ہیں کہ موجودہ بلوچستان میں یہ باہر سے آکر آباد ہوئے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بلوچستان کے تشخص اور آزاد بلوچستان کیلئے وہاں کے حریت پسند عبدالصمد خان اچکزائی نے بہت کام کیا وہ بلوچ نہیں پشتون تھے ، 1932ء میں جیکب آباد میں ہونیو الی آل انڈیا بلوچ کانفرنس کی صدارت عبدالصمد خان اچکزئی نے کی اس کے علاوہ وہ ساری زندگی بلوچستان کے حقوق اور بلوچستان کی شناخت کے لئے کام کرتے رہے ،2 دسمبر1973ء کو عبدالصمد خان کو شہید کیا گیا تو ان کے بیٹے نے بلوچ حقوق کی بجائے پشتون موومنٹ کے حوالے سے کام شروع کر دیا، یہ صرف ایک نہیں بلکہ سینکڑوں مثالیں ایسی ہیں کہ بلوچ نہ ہوتے ہوئے سیاسی رہنمائوں نے بلوچ شناخت کے لئے کام کیا۔ 1930ء میں میر عبدالعزیز کرد نے ''انجمن اتحاد بلوچاں'' کے نام سے خفیہ تنظیم قائم کی جس کا مقصد انگریزوں کے خلاف بغاوت اور آزادی تھا، 1893ء تا 1930ء کے دوران انگریزوں نے بہت مظالم کئے جس کی بناء پر ریاست قلات اور دوسرے علاقے کے لوگوں کووقت اور حالات نے بلوچ اتحاد کے نام سے اکٹھا کر دیا، حالانکہ یہ لوگ بلوچ نہیں دوسری قومیتوں سے تعلق رکھتے تھے ، یہ وہ زمانہ تھا کہ ریاست قلات کے فرمانروا کو انگریزوں نے غیر اعلانیہ طور پر معزول کیا ہوا تھا، خان قلات میر محمود خان اپنے محل میں محبوس کر دئیے گئے تھے۔

Q.NO.03

مبارک ہیں وہ راوی، موسیقار و ڈوم فنکار جنہوں نے انتہائی احتیاط و محبت سے بلوچی کلاسیکی شاعری کو حفظ کیا اور شاعری کے اس ذخیرے کو مسلسل آئندہ نسلوں تک منتقل کیا۔ جس سے بلوچوں کو علوم و فنون کے قدیم دفینوں کی وسیع تر آگاہیاں ملیں۔ ابتدائی قبائلی دور کے اس صاحب فن دانشوروں اور شاعر حضرات نے بلوچی زبان و بلوچوں کی تاریخ کو ہزار ہا سال سے قائم رکھ کر بلوچوں پر عظیم احسان کئے۔رزمیہ، بزمیہ، و عشقیہ شاعری انہی عظیم فنکاروں کی مرہون منت ہے۔ فصاحت و بلاغت انہی کی قوت فکر و نظر اور ذہنی فراست کی مظہر و پرورده رہی ہے یہ پوری قدیم شاعری سادہ، پر جوش اور حقیقت پر مبنی ہے۔ انہوں نے ایسی مناظر کشی کی ہے جیسے وہ خود میدان جنگ میں موجود ہیں لڑائیوں مین شامل ہین اور حملہ کے وقت سب سے آگے ہین اور کمنڑی

کرتے جارہے ہین عشقیہ شاعری مین ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاعر خود کسی محبوبہ کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہیں۔ موتک یا مرثیہ میں ایسے الفاظ لائے جیسے ان کا اپنا دوست یا عزیز فوت ہوگیا ہے۔ بلاشبہ یہ عوام کی شاعری ہے ان میں عوام کے دلوں کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔آج بھی عوام اپنی شبینہ محفلوں میں ان نغموں کو الاپتے ہیں تو وہ مسرت و روحانی فرحت و قلبی تسکین سے سرشار ہوجاتے ہیں۔ا ن اشعار میں آج بھی عوام کے دلوں کے تار چھیڑنے کی صلاحیت ہے۔ ان کا ہر مسرعہ چونکہ شاعر کے دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا ہے اس لئے اب بھی دل پر اس طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ صدیاں گزرجانے کے باوجود چاکرو گہرام، شے مرید وحانی، حمل و ماہ گنج و بالاچ گور گیج وغیرہ کی نظمیں بلوچوں کے جذبات کی ترجمانی ہیں۔ بدقسمتی سے کالونیل تسلط اور خارجی اثرات کے باعث یہ روایتی سلسلہ معدوم ہوتا گیا۔ تاہم پچھلی صدی تک بلوچی شعر گوئی کی روایات اتنی وسیع تھیں کہ صرف ڈیرہ غازی خان اور متصل علاقے میں ایم لانگ ورتھ ڈیمس نے بلوچی اشعار کے ایک اچھے خاصے ذخیرہ کو جمع کر کے اپنی کتاب"پاپولر پونٹری آف دی بلوچیز" میں چھاپ دیا اور دوسری جلد میں اس کا انگریزی ترجمہ حواشی کے ساتھ دے دیا اس طرح لالہ ہیتھورام نے بلوچستان کے قبائل کی تاریخ اور "بلوچی نامہ" میں بلوچی دپتہ(نسب نامہ) کے کچھ اشعار چھاپ دیئے۔ لیکن یہ بہت ہی قلیل ذخیرہ تھا کہ جو دائرہ تحریر مین لایا گیا ۔ بعد ازاں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے کچھ گوہر قیمتی یکجا کر کے چھاپ دیئے لیکن اس سے کئی گان زیادہ اشعار جو بلوچ ذہین رادیوں اور فنکار ڈوموں اور فنکار موسیقاروں کو یاد ہیں۔ بے وسیلہ غریب بلوچ ان کو ضابطہ تحریر میں لانے کے لئے اس جدید دور مین بھی قاصر ہے۔ عام بلوچوں کی بڑی تعداد خشک بلند پہاڑوناور چٹیل وسیع میدانوں کی سرزمین میں آباد ہے۔ جو ترقی پزیر اور پسماندہ ہے جہاں انسان روٹی اور روزی کے مسئلہ میں کچھ ایسا بے سدھ اور الجھا ہوا ہے کہ آسمان کی اور پر جگمگاتی شفق کو بھی وہ نظر بھر کر نہیں دیکھ پاتا۔ فطرت کی سرشاری اور انسانی زندگی کی سرمستیوں مین عام آدمی کا حصہ کم ہو کر رہ گیا ہے۔ قبائلی نظام کی جکڑ بندیوں کے محور پر گھومنے والے معاشرے کے غریب باسیوں کو ان کے آقاو ¿ں کے کاسریسوں نے بھوک اور مفلسی کو اپنی فلسفہ طرازی سے محترم اور مستحسن بنانے میں اپنی ساری توانائیاں صرف کردی ہین تاکہ عام آدمی فن سانس کی طرح زندگی کے ساتھ ہے، وہ زندگی کے ہر موڑ پر اس کی عکاسی بھی کرتا ہے اور اس کو نئے موڑ بھی دیتا ہے تشخیص مرض بھی کرتا جاتا ہے اور مسیحائی بھی کرتا رہتا ہے۔ فن انسان کو نظر بھی بخشا ہے اور تخیل کا مجرم ، تصور کی دل کشی کا عارف اور نکات کا رمز آشنا بھی بناتا ہے۔ خانہ بدوشوں، شتر بانوں، دہقانوں اور چرواہوں کو نغموں سے فطری لگاو ¿ ہے ان کو بند اور محصور

معاشروں کا باسی بنا کر ان کی فکر و نظر کو نغموں کی آزادیوں اور آسودگیوں سے کسی نہ کسی بہانے محروم رکھنے کی مذہب کے نام نہاد ٹھیکیداروں نے کوششیں کیں اور فن کی کیف زائی کو فلسفہ طرازیوں کے ذریعے مسخ کرکے سرشاری کو عذاب میں لطف کو کرب میں تبدیل کرنے کی سعی لاحاصل کی۔ لیکن بلوچ بچوں کو سلانے، کپڑے سینے، چکی چلانے، بچے کی پیدائش پر، کسی کی یاد مین، کھیتوں میں، اونٹوں کے داروان میں، ریگستانوں کے سفر میں چروا ہے پہاڑوں کے دامن میں ، شادی میں گیت الاپتے رہے وہی صدیوں پرانے روایتی گیت جو قدیم و جدید شعراءنے انسانی بقاءکی راہ مین، سماجی ناہمواری، نا انصافی و غلامی کے سنگ گراں کو دور کرنے کے جہاد مین مصروف اپنے ہیروو ںں کی یاد مین رقم کئے تھے۔

ہر ہیرو ہو وہ فنکار جس کے پاس جذبہ بے اختیار تھا یہ جذبہ انہوں نے آویزش و کشمکش سے پیدا جن میں پس منظر بھی کیا اور اس کو بڑی مہارت و تکنیک سے مو ثر پیرائے سے نظموں میں ڈھالا ہے اور منظر کشی بھی تعیم اور رموز بھی جو کالو تیل اور قبائلی جبر کے بانجھ پن کے خلاف احتجاج بھی کرتے اور اس فرسودہ نظام کی بے چہرگی کا اظہار بھی کرتے، داخلی و خارجی واردات و معاملات کا حسن توازن و آہنگ بھی ہے۔ اور امن و آزادی ، انسان دوستی کے نغمے بھی جنہیں شعراءنے زندان کی اداس شام میں، محبت دلبراں میں یا محفل اہل جنون میں دلنوازی سے ترتیب دیئے جہاں انہوں نے رجائیت کے نئے باب کھولے۔ ظلمت کدوں میں دم توڑتی خواہشات ان کے جلومیں نئے جزبوں سے ہمکنار ہوئیں یہ شعراءجدوجہد کے ایسے پیامبر ہیں جنہوں نے امید و عرض تمنا کا دروازہ کبھی بند نہ کیا ہر کوئے جفا مین ان کی جہد مسلسل کی داستان دہرائی جاتی رہے گی۔ ان شعراءکا خیال نغمہ وشعر میں ڈھلا اور فکر ادب و جن کو نئے قالب عطا کر گیا ان شعراءکا رنگ اور خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی محسوس ہوتی ہے وسیع چراطاہ مین جب بارش کا موسم ہوتا ہے اور دشت و بیاباں وادیاں لالہ زار بن جاتی ہیں تو شعراءکا سگند بھینی بھینی سی ٹھری ہوئی اپنی تمام گھمبیر تا سے آہستہ آہستہ دلوں مین اترتی ہوئی آنکھوں میں نئے منظروں کو جنم دیتی ہے بارود کی مکدر فضاءہو یا زندان کی بیزار کن رات ان شعراءکے سخن ہر جگہ نئے چاند اتارتے ہیں۔

ان کے آہنگ میں للکار بھی ہے سوزو یقین بھی، جہدو انقلاب کی گھن گھرج بھی ہے اور حس و محبت کی شیریں نوائی بھی ان شاعروں نے اپنی قدیم فصیح و بلیغ زبان میں شتر بانون ساربانوں اور گلہ بانوں کی تہذیب، تمدن معاشرہ و تاریخ کو رقم کیا ہے شاعرپہاڑون وادیوں اور دشت و صحرا مین اپنے مال و مویشی کے پیچھے گھومتا پھرتا وہاں پر بوویاش رکھنے والے چرند و پرند کے علاوہ

بادل بارش و کہر، بجلی کی چمک، تندو تیز آندھیوں اور جھکڑوں کے طوفان اور بھپری ہوئی پہاڑ، ندیوں کی طغیانی، موسم بہار کی پرکیف شب و روز، سبز گھاس، جنگلی پھولوں کی مہک کو اور پھر گرمیوں کے دن جب لوار (لو) شعلے برساتی ہوئی چلتی ہے اور سردیوں کا موسم جب گوریچ (شمال کی سرد ہوا) جو ہڈیوں کے گودے تک جمادیتی ہے۔ یہ تمام قدرتی مناظر جو اس کی آنکھوں کے سامنے رہے انہی میں سے وہ اپنی نگار شات، تصورات،تشبیہوں، استعاروں کا انتخاب کرتا اور کمال چابک دستی سے ان کو اپنے اشعار کا جامہ پہنا کر نہایت خوبصورتی اور دل آرائی سے پیش کیا کرتا۔

(ملا فاضل کہتا ہے(ترجمہ

اے جاں یہ خموشی کیسی

جاناں یہ اداسی کیسی

تو ایک دھڑکتی لے ہے

نغمہ ہے سرورنے ہے

سنوارے تو پھواروں کا راگ

!جھکے مرمریں گل اندام

برفاب بدن

مہ پیکر

قندیل شب غم پرور

اک لطف نظر ہو ہم پر

ہم تیرے لئے دیوانے

جام ورک کہتا ہے

میری محبوبہ کو نج کی مانند

صبح اٹھ کے سیر کو نکلے

اور خراماں کبوتری کی طرح

مجھ کو اپنی ادا سے بہلائے

سوت کے بول ہیں جو پر مسرت تقریب میں گائے جاتے ہیں۔

اوستارہ سری

(اے سلمہ ستاروں سے مزین دوپٹے والی)

او ستارہ سری

مارڈالے گی یہ خوش خرامی تری

مست رفتار ہے جیسے کبک دری

ستارہ سری

ان سنوارے ہوئے گیسوو ں کی قسم

تو ہے میرے خیالوں کی نیلم پری

اوستارہ سری

تیرا جوبن سنگھار

اور میرے لئے؟

اک قیامت ہے تیری کرم پروری

اوستارہ سری

تیرے ہاتھوں کی مہندی ہے افسوس رنگ

اور زلفیں گھٹاو ں کی جادوگری

او ستارہ سری

تیرا رنگین ملبوس

(کشکوگوری (ایک خاص بلوچی کشیدہ لباس پہننے والی

تو چمکتے ہوئے چاند کی مانند ہے پری

او ستارہ سری

پاکستان کا رقبہ کے لحاظ سے سب سے بڑا صوبہ بلوچستان جہاں بلوچ بڑی تعداد میں آباد ہیں بلوچ عظیم الشان حکومتوں کی بیرونی حدود میں رہنے کے باوجود اور بے فیض دشوار گزار خشک پہاڑوں ریگستانوں بے آب وگیاہ سرزمین سے قوت لایموت حاصل کرنے کے باوصف بلوچوں نے اپنے قومی تشخص کو برقرار رکھا ہے اور اب بھی ایک مخصوص قوی اکائی کی حیثیت سے قائم ہیں۔ جس کی اپنی تہذیب اور زبان و روایات ہیں پاکستان میں بلوچ بلوچستان کے علاوہ سندھ پنجاب و سرحد میں بھی آباد ہیں بیرون پاکستان ایران افغانستان، عربستان، افریقہ و ترکمانستان، میں بلوچ بڑی تعداد میں آباد ہیں "بلوچی" بلوچوں کی زبان کا نام ہے قوم کا نام صرف بلوچ ہے ملک کانام بلوچستان ہے۔ "مکرانی" نہ تو کسی قوم کانام ہے اور نہ ہی زبان کا مکران بلوچستان کا ایک ضلع ہے جس میں باقی بلوچستان کی طرح بلوچ رہتے ہیں۔کسی فرد کو قوم یا زبان کے نقطہ نظر سے

”مکرانی“ کہنا غلط ہے ۔ بلوچی زبان کا موجودہ رسم الخط عریک ہے جسے خط نستعلیق میں لکھا جاتا ہے۔ بلوچی زبان مین مو ںنث و مذکر نہیں ہے قدیم بلوچی شاعری پر فارسی رنگ غالب نہیں بلوچی نظمیں بالکل آسان صاف سیدھی اور براہ راست الفاظ میں لکھی گئی ہیں۔ 1905 ءمیں ایم لانگ ورتھ ڈیمس نے بلوچی شاعری کے منتشر جواہر پاروں کو یکجا کرکے اپنی کتاب” پاپولر ہوئٹری آف دی بلوچیز“ کے والیوم نمبر ۱ اور نمبر ۲ میں شائع کیا ہے ایک جگہ رقم طراز ہین کہ ”بلوچی نظمیں بلوچوں کے خطے اور قوم کی زندگیوں کی سچی واضح اور سیدھی سادھی عکاسی کرتی ہیں اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے اعلی و شاندار ہین شاعر فنکاری سے ایک نقشہ کھینچا چلا جاتا ہے جس سے چشم تصور محو حیرت بن جاتی ہے شاعر قبائلی جنگوں اور جنگی سورماو ںں کے کارناموں کا ذکر اس حسن و خوبی سے کرتا جاتا ہے کہ ان کی تمام تر حرکات و سکنات کا نقش پڑھنے والوں کے ذہنوں میں اجاگر ہوجاتا ہے۔

قدیم شاعری میں نبرد آزمائی ، فتح و نصرت، شجاعت، جذبہ انتقام، رومان پروری اور میر چاکر، میر گہرام میر بجار، حمل حبیئد پیرو شاہ، بیرک، رامین، شہداد،جاڑو، ریحان، میر جان، نو بندگ ، بیورغ، ملک سہرب، بابر، غازی خان، فتح خان، گاجیان دودائی۔ حسن، دودوا اور بالاچ کے کارناموں سے پر ہے۔

بلوچی ادب میں اب تک ہمیں فقط پندرھویں صدی کے بعد کے شہری ادب کا سرمایہ ہاتھ لگا ہے البتہ پندرھویں صدی سے پہلے کہ دو ہے، لوک گیت، کھیلوں کے گیت اور پہیلیوں وغیرہ کا کچھ حصہ بھی لوگوں کو زبانی یاد ہیں۔ جن کوضبط تحریر میں نہیں لایا گیا ہے پندرھویں صدی اور اس کے بعد کے ادب و واقعات کا ذخیرہ ہمیں لانگورتھ ڈیمس، رچرڈ برٹن، میئر، فلائیر، لیچ، ڈاکٹر ڈارون، سرہنرپوٹنگر، چارلس میسن، میگروگر، پوسٹنس، پروفیسر منور سکی، منیر بیلی، ڈاکٹر گراشوچ ڈاکٹر جوزف، گل خان نصیر، میر شیر محمد مری، بشیر احمد بلوچ، عطا شاد اور عبداللہ جان جمال دینی کے توسط سے دستیاب ہواہے اور نظریات کے مطابق اس وقت کے بلوچوں کی زندگی کے ہر پہلو پر طبع آزمائی کی گئی ہے ان میں بلوچوں کی حقیقت ہ ہجرت حسن و عشق کی داستان و تاریخ گیت رزمیہ واقعات، ماحول اور کرداروں کو لیلٹری ، لیلی مور، ڈیہی ، مورو، صوت، لاڈوک، ھالو۔پست، زہیروک، لیکو، موتک کے اضاف میں طربیہ ، ہجو، قصیدہ، حکایات روایات و واقعات کو قابل مطالعہ شکل مین پیش کرنا بھی شعراءکی جانگا ہی کی دلیل ہے رزمیہ اشعار کو بلوچ قوم کی OHYSSEY افتاد طبع اور قومی روایات کے پیش نظر اولیت حاصل ہے جن کی مثال یونانی کی طرح ہے مغربی یورپ کے ڈاکٹر میسن اور ڈاکٹر گیگر نے اپنے عہدے کے بلوچستان ILANDاور

اور وہاں کی زبان پر روشنی ترکمانستان کے علاقے مرو کے بلوچوں سے بلوچی لوک گیت جمع کئے اور ان کا ترجمہ1960 ءمیں روسی زبان میں چھاپا۔ 1959 ءمیں پیکولین نے ماسکو سے بلوچ نامی تحقیق کتاب چھاپی۔ الطبری، ابو شجاع ادھواری، بلال حسن محسن ، ابن مشکا دیہی اور فردوسی نے بلوچوں کا تذکرہ اپنے نگارشات میں کیا۔ جام ورک1740-1796) ئ)بلوچی زبان کے سب سے بڑے اور معتبر شاعر گزرے ہیں نثرو جدید نظم میں سب سے بڑا نام گل خان بصیر کا ہے قدیم شعراءمیں ملا فاضل ، ملک دینار، رحیم علی مری، مست توکلی، جو انساں، عزت بیگ، پنجکوری، ملا قاسم، ملا نور محمد، ملا اسماعیل، مندو کہیری، چکھا بزدار، مانے ہوئے استاد شعراءہیں موجودہ دور میں آزاد جمالدینی، محمد حسن عنقائ، آدم حقانی، عبدالصمد امیری، غفار ندیم، سید ظہور شاہ ہاشمی، عطا شاد، اکبر بارکزئی، ملک طوقی، مراد ساحر، بشیر بیدار، جی آرملا، قاضی مبارک، عیسیٰ قوی، شیر محمد مری، غنی پرواز، الفت نسیم، مومن بزدار، اللہ بخش بزدار،بانل دشتیاری، احمد جگر، حضرت شاہ، مراد آوارانی، کریم دشتی، جان محمد دشتی، صدیق آزاد، ظفر علی ظفر، غلام فاروق، عبدالرحمن غور، میر مٹھا خان، غنی پرواز ، عبداللہ جان جمالدینی، لالا غلام محمد شاہوانی، امان اللہ لچکی، محمد بیگ، میر عاقل خان مینگل، حکیم بلوچ،صورت خان مری، انجم قزلباش، آغا میر نصیر خان احمد زئی، عزیر محمد بگٹی، واجہ ایوب بلوچ نے بلوچی زبان، ادب و تحقیق میں بہت بڑا مقام و نام پیدا کیا۔ قیام پاکستان کے بعد ۹۴۹۱ ءمیں ریڈیو پاکستان کراچی سے بلوچی زبان میں ۵۴ منٹ کی نشریات کا آغاز ہوا۔ کراچی میں ۲۵۹۱ ءمیں سرچمک کے نام سے ایک ادبی تنظیم بنی۱۵۹۱ ءمیں کوئٹہ میں بھی ”لٹ خانہ“ کے نام سے ایک ادبی تحقیقی تنظیم قائم ہوئی جس میں عبداللہ جان جمالدینی (جو کافی عرصہ سے بلڈ پریشر کے مریض ہیں عبداللہ جان صاحب آج کل کوئٹہ میں بلوچی اکیڈمی کے چیئر مین ہیں۔ پروگریسیو رائٹرز ایسوسی ایشن کے سرپرست ہیں۔ اکیڈمی ادبیات کے بزرگ اور ادبی تنظیم ”لوزچیدگ“ کے سرپرست اعلیٰ ہیں ان کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے یونیورسٹی میں بلوچی کی کلاسیں ہوتی ہیں۔

آج کل یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور بیمار ہیں۔) آزاد جمالدینی، گل خان شیرانی، ڈاکٹر خدائیداد، سردار بہادر خان جنگلزئی، حبیب اللہ اور شیر محمد مری وغیرہ نے قائم کی۔ ایک ادارہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کے نام سے سرداری خرچے پر بہت شاندار کام انجام دے رہا ہے۔اس اکیڈمی نے گرانقدر شہپارے شائع کرائے۔ بلوچی پبلیکیشنز نے کراچی سے گل خان نصیر کی کتابیں گلبانگ، شب گروک شائع کیں۔آج کل عزت اکیڈمی پنجگور آزاد جمال دینی اکیڈمی نے کراچی میں بلوچی زبان کی بہت کتابیں شائع کیں۔ فاضل اکیڈمی کراچی میں دو کتابیں مراد کی پہاڑ، احمد ظہیر کی زپتین ذھیر شائع سی

کرکے بند ہوگئی۔ سید ہاشمی اکیڈمی کراچی میں ہے۔ لبذا مکی دیوان ہے۔ بلوچستان اکیڈمی مکران ہے۔بلوچی ادبی گل کراچی میں ہے اس کے علاوہ بلوچی ادبی سوسائٹیاں ملتان، انگلینڈ عرب امارات اور بحرین میں بھی قائم ہیں۔ ایرانی بلوچستان سے زریں نگار نے بلوچی گرامر، جالق داد آریا نے رسالہ "مکران " شائع کیا۔

۱۹۸۳ءمیں میجر گوکسٹن نے مسقط عمان سے بلوچی نظموں کی کتاب بمع انگلش اور عربی ترجموں کے ساتھ شائع کی۔ ۱۹۸۰ءمیں انہوں نے ایک بلوچی انگلش وعربی ڈکشنری بھی شائع کی۔ ۱۹۸۳ءمیں این اے کولیٹ نے بلوچی گرامر بھی ایک کتاب شائع کی۔ ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان سے شائع ہوتا ہے۔ ملتان سے بلوچی زبان مین ریڈیو پاکستان ملتان سے پروگرام بھی ہوتا ہے۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے ۱۹۶۱ءمیں عطا شاد اور عین سلام کا بلوچی عوامی گیتوں کا مجموعہ مع منظور اردو ترجمہ درین کے نام سے شائع کیا۔ درچین نامی ۱۹۶۱ءمیں جام ورک کے مجموعہ کلام کے بعد یہ بلوچی اکیڈمی کی یہ دوسری پیشکش تھی۔ ا س کے علاوہ ڈکشنری، گرامر قدیم شعراء، کلام، جدید شعراءکی تحقیق لوگ گیت، لوگ داستان تاریخ اور دو جلد میں بلوچی ادبی تاریخ ، انگریزی زبان میں شامل کئے۔

پرانے شعری ادب کے اضاف میں لیو (لوری) دو گال (دو مصرعوں والی) سوت (گیت) لیے شاعری (کھیل کے گیت) زہریگ (بچھڑے ہوئے عزیزوں دوستوں کی یاد میں حزن و ملال کے درد بھرے گیت) موتک (مرثیہ) نازینک (دولہا یا دلہن کی تعریف میں کہی گئی نظم) ہالو(یہ بھی نازنیک کی طرح ہے) صفت (زچہ و بچہ کے لئے چھ دن تک گائی گئی نظم)پست (اللہ کے ذکر اور دعاویہ لمبی نظموں کو بھی کہا جاتا ہے۔)چاگان (مذہبی گیت) و غیرہ۔

ریڈیو پاکستان کراچی سے ۱۹۴۹ءمیں ۵۴ منٹ کی نشریات کا آغاز ہوا۔ جو ۱۹۵۶ءمیں بند کردیا گای اور ہنوز بند ہے آج کل کوئٹہ ٹی وی اور ریڈیو سے ملتان، تربت، خضدار ریڈیو سے بھی بلوچی پروگرام نشر ہوتے ہین ۱۹۵۲ءمیں بلوچی پروگرام نشر ہوتے ہیں ۱۹۵۲ءمیں بلوچی زبان کا پہلا ماہنامہ "اومان" کے نام سے جاری ہوا جو بلوچی اور اردو ذبان میں تھا۔ اس کے بعد ۱۹۶۱ءمیں کراچی سے مکمل بلوچی زبان مین نمائندہ رسالہ "بلوچی" کے نام سے جاری ہوا جو تاہنوز جاری ہے ۱۹۵۹ءمیں مستاگ کے نام سے بلوچی اکیڈمی کراچی نے ایک شعری مجموعہ شائع کیا جو جمعہ خان بلوچ اکبر بارک زئی اور مراد ساحر کی کوششوں کا ثمر تھا۔ اس میں گل خان نصیر، عبدالواحد آزات جمالدینی، سید ہاشمی، مراد ساحر، محمد اسحاق شہیم، عطا شاد، قاضی عبدالرحیم صابر، عبدالحکیم حقگو، ملک محمد طوتی، احمد زہیر، محمد حسن عنقا، ملک سعید ، انور شاہ قحطانی،

شوکت حسرت، اکبرباز کزئی، احمد جگر، ناگمان جمعہ کلاچی، دوسرت محمد بیکس اور رونق بلوچ کے نمائندہ اشعار اور زندگی کے حالات شائع ہوئے اس کے بعد کراچی میں اکیڈمی نے شیر محمد مری کی کتاب "بلوچی زبان وادبے تاریخ" شائع کی مراد ساحر عبدالرسول نظامانی، واجہ محمد بیگ بلوچ، واجہ ملک محمد طوتی اور اکبر بارک زئی نے ۱۹۶۳ءمیں پہلا بلوچی قاعدہ زھگ بلد کے نام سے شائع کیا۔محمد سردار خان بلوچ نے ۱۹۵۸ءمیں تاریخ بلوچ انگریزی زبان میں تحریر کر کے کتابی صورت میں شائع کیا اور غلام محمد شاہوانی نے نوائے وطن نامی رسالہ شائع کی اس کے فوت ہونے کے بعد ملک محمد پناہ نے اس رسالے کو مسلسل شائع کیا۔ غلام محمد شاہوانی کوئٹہ کے بہت ہی ذہین صحافی بھی تھے جو وہاں سے مختلف وقتوں میں شائع ہونے والے تین اخباروں کے ایڈیٹر بھی رہ چکے تھے نوجوانی میں اپینڈکس کی وجہ سے فوت ہوئے اس کا خلاءکبھی بھی پر نہ ہوگا بلوچستان میں اتنا ذہین، باکردار اور بہادر صحافی پھر نہ پیدا ہوا۔ ۱۹۶۱ءمیں کوئٹہ سے "اویس" کے نام سے بلوچی رسالہ حکومت نے شائع کیا۔کراچی سے ۱۹۶۸ءمین ایک پندرہ روزہ "زمانہ" شائع ہوا کوئٹہ سے اس زمانے میں ایک ہفت روزہ نوکیں دور شائع ہوا تھا۔ جسے شورش بابو عبدالکریم امن نے جاری کیا۔ جسے آج کل شاہ محمد مری شائع کرتے ہیں۔ اس رسالے کے موجودہ ایڈیٹر و پبلشر زیب النساءشورش ہیں۔ ۱۹۶۲ءمیں سید ظہورشاہ ہاشمی کی چار کتابیں چھپیں۔ ۱۹۶۳ءمیں کریم دشتی کی دو کتابیں شرد گداری اور مئے لوزانک چھپیں ۱۹۶۴ءمیں گل نصیر خان کی دوستین وشریں نامی خوبصورت شاندار منظوم داستان جس کا پیش لفظ آزاد جمالدینی نے تحریر کیا تھا۔۱۹۶۴ءمیں بلوچی اکیڈمی نے کوئٹہ نے کچین نامی کتاب ۱۹۷۰ءمیں ظہور شاہ کی "میر گند" نامی کتاب اور حاجی قیوم بلوچ کا قاعدہ"بلوچی زھگ بلد" بلوچی بومیا ۱۹۶۸ءمیں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے گیدی قصہ کے نام سے دو کتابیں گشین کے نام سے ایک مجموعہ مضامین کا چھاپا بعد ازاں لغت اور تاریخ اور محاوروں کی کتابیں چھاپیں۔ شہر مرید و حانی،شہداد مہناز للہ و گراناز، دوستین شیرین، شاہ بیگ و گراناز، عزت ومہرک، کیا وسدو، سسی و پنوں، حمل و ماہ گنج کی عشقیہ داستانوں میں بہت سی داستانوں کو بڑی تحقیق کے بعد بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے چھاپیں۔ اس کے علاوہ یوسف عزیز مگسی نے آنے والی بلوچ نسلوں کے لئے ایسے نقوش یادگار کے طور پر چھوڑے ہیں جو یادگار ہیں۔ انہوں نے بلوچستان کے بنیادی حقوق و خود مختاری کے حصول کی خاطر ایک انقلابی تحریک کی بنیاد ڈالی اس کے لئے مقالات و مضامین لکھے اور شاعری کی انجمن اتحاد بلوچاں کے نام سے ایک تنظیم بنائی اس کے بعد اسٹیٹ نیشنل پارٹی کا قیام عمل میں آیا یوسف عزیز مگسی کو ۱۹۳۰ءمیں شمس شاہ کے خلاف مساوات لاہور میں ایک مضمون لکھنے پر قید کی

سزادی۔ انہوں نے ۳۶۹۱ءمیں جیکب آباد مین کل ہند بلوچ کانفرنس کا انعقاد کرایا جس کے اختتام پر عزیز مگسی کا مشہور قومی گیت گایا گیا۔۱۹۴۳ءمیں اسے لندن روانہ کردیا گیا۔ ۳۱ مئی ۵۳۹۱ءمیں کوئٹہ کے زلزلے میں انتقال فرماگئے۔ گل خان نصیر نے ان کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اسے تخم آزادی قرار دیا۔علامہ اقبال کی مشہور نظم بڈھے بلوچ کی نصیحت بھی اس زمانے کی ہے۔ مولانا ظفر علی خان نے اس پر ایک نظم لکھی جس کا عنوان تھا"انقلاب اور بلوچستان"

بلوچ معاشرہ بلوچ قوم اپنے جداگانہ مزاج و کردار کی بنا پر جدا گانہ ثقافت کی حامل ہے۔ جس میں بلوچی رسم افراد کی اجتماعی اختیار ات و خواہشات کی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ان میں ایک ہے بجار: یہ امداد باہمی کی رسم ہے۔ مہمان نوازی: قبائلی علاقوں مینمہمان پورے گاو ¿ں کا مہمان بن جاتا ہے سب باری باری اس کے لئے کھانے کا انتظام کرتے ہیں باہوٹ: پناہ پانے والے کی حفاظت فرض ہے خواہ دشمن ہی کیوں نہ ہو یہ رسم محروم بے بس اور مظلوم کے لئے نجات کا ذریعہ ہے۔ میار جلی یا پتر وچتر: اس میں عفو و درگزر کا جزبہ ہے اگر کسی قصور واریا مجرم خاندان کی ایک عورت متعلقہ فریاد خاندان کے گھر جائے تو اس کے قصور و جرم کو معاف نہ کرنا بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ بیر: اس کے بارے مین ایک شاعر کہتا ہے کہ(ترجمہ) بلوچوں کا انتقام پتھر کی طرح سخت اور پائیدار ہے اگر کنویں کے اندر پتھر گھس سکتے ہیں تو بلوچوں کے انتقام کی آگ بھی ٹھنڈی پڑسکتی ہے۔

بلوچوں کا انتقام صدیوں تک دو دانتوں والی ہرنی کی طرح سدا جوان ہی رہتا ہے۔ بلوچی ادب قومی و خاندانی انتقام لینے کی لوریوں سے لبریز ہے شاعر کہتا ہے ترجمہ: میری اور تیری صلح گفت و شنید اسی وقت ممکن ہے جب گیدڑ مرغیوں کا پاسبان بنے پہاڑی چیتا اونٹوں کے گلے میں شامل ہوجائے۔ خونخوار بھیڑیئے مویشیوں کے نگہبان بنیں۔سمندر کی مچھلیاں خشکی پر آجائیں۔ روئی اور آگ کا میل ہوا گر یہ باتیں ممکن ہوسکتی ہے۔ سیاہ کاری: بلوچی رسوم کے مطابق بد چلنی کی سزا موت ہے۔ حال و جریاچہ جر: اس رسم کی وجہ سے بلوچ معاشرے کو حال رسانی و خبر رسانی کی سہولت حاصل ہوگئی ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ پہلا مختصر حال و جر اور دوسرا تفصیلی حال و جر ہے۔ کسی اجتماع میں حال و جر پوچھنے کا ااستحقاق ہمیشہ خاندان ، قبیلہ یا گاو ¿ں کے ممتاز اور بزرگ ہستی کو حاصل ہوتا ہے اور باقی لوگ ہمہ تن گوش ہوکر حال سنتے ہیں نکان: شادی ہو یا مرگ یا بڑی اہم ضرورت کے موقع پر متعلقہ خاندان کے لوگ اپنا غلہ وغیرہ پسینے کے لئے دوسروں لوگوں مینبانٹ دیتے ہیں۔اس میں خاندان کے کسی فرد کی وفات یا موت پر ماتم کیا جاتا ہے ۔ جسے "پرس " کہتے ہیں۔ اعزاز ورفقاءاور دور نزدیک کے لوگ اظہار ہمدردی کے لئے متعلقہ خاندان کے ہاں جاتے

ہیں۔ جسے "پرس نامہ" کہا جاتا ہے ماتم کے دوران خواتین نوحوں کی طرح اشعار پڑھتی ہیں۔ جنہیں "موتک" کہا جاتا ہے چند مصرعے ترجمہ: میری بخت کو سیمرغ نہیں لوٹاسکا۔ بھلا اس دور کے ملا کہاں لوٹا سکیں گے۔

دو مصرعہ ترجمہ: ہوا کتنی بھی چلے (قبر میں) تمہارے دل کو کوئی ہوا نہیں لگتی۔ بارش جتنی بھی برسے تمہارا دوپٹہ نم ناک تک نہیں ہوگا۔ ملا بہادر کے موتک کے چند بند: ترجمہ شیر ببر کی طرح نڈر داد کریم نے بچھو جیسی ڈسنے والی تلوار کمر باندھ لی۔ اور دودراز کے سفر روانہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ وہ ہندوستان پہنچ گیا اور وہانموت کی تلخ شربت کاپیالہ نوش کیا۔ آفرین ہے ان ماو ¿ں کے دلوں کو کہ جن کے بیٹے ہندوستان میں سپاہی ہیں اور ہندی سندھیون کے ہم نوالہ او ر ہم پیالہ ہیں۔ مائیں ان بیٹوں کے لئے اور بیٹے ان کی ماو ¿ں کے لئے کونج کی مانند پہروں کو کوکتی ہیں اور رام شدہ شاتل (ایک پرندہ) کی طرح نالہ کش ہیں جب کبھی بچے کھیلتے کھیلتے اچانک یاد کرتے ہیں تو جیسے میرے دل کو ڈائنیں نوچ کر لے جاتی ہیں دیوان: شام کی بیٹھک ، جہاں بحث و تمحیص ہو، اہم فیصلے ہوں یا شعراءکا کلام سنایا جائے ساز و سرو دو نغمے الاپے جائیں، دیوان کہا جاتا ہے ۔ شادی بیاہ کے آخر ی دن ضیافت کو بھی دیوان کہا جاتا ہے۔ چوگان: یہ ایک قدیم بلو چی رسم ہے جسے بعد مین مذہبی شکل دے دی گئی ہے اس مین مذہبی شکل دے دی گئی ہے اس مین مذہبی شعر پر رقص کے قدیم مرتب کئے گئے اس میں بغیر ساز کے ہر ایک قسم کے اشعار کو ادا کرنے اور حرکات کے طریقے جدا جدا ہیں۔ اس مین شریک تمام لوگ ایک حلقہ بنا لیتے ہین اور درمیان میں خوش حرکات کے ساتھ ساتھ قدم بڑھا گلوشخص مخصوص انداز میں شعر پڑھتا ہے اور دوسرے مخصوص کر جواب دیتے ہیں۔ راجی زمین: جہاں زمین پورے قبیلے کی ملکیت ہو پیداوار مساوی تقسیم ہوتی ہو۔ آمین و پانچی: کھجور پکنے کے موسم کو "آمین" کہا جاتا ہے آمین کے دوران جو شخص کھجوروں کے باغات میں چلا جائے اس کے تھیلے کو کھجوروں سے بھر دیا جاتا ہے۔ اس رسم کو پانچی کہا جاتا ہے۔ آس و آپ : پانی کے اوپر جنگ کے زمانے میں کچھ ایسے نشانات چھوڑے جاتے ہیں جو قبائلی "کوڈ ورڈ" کا کام دیتی ہیں۔ رات کے وقت اگر ساتھی بچھڑ جائیں تو پہاڑ کی چوٹی پر آگ جلا کر پیغام دیا جاتا ہے۔ مجرم کی پہچان کے لئے اسے آگ کی آزمائش سے گزارا جاتا ہے۔ منگیر : ساحلی علاقوں میں اجتماعی شادی کی رسم کا نام ہے۔بلوچ عورت کی بہت عزت کرتے ہیں اس کو لڑائی کے دوران زک نہیں پہنچاتے۔ ان رسموں سے بلوچوں کی قومی کردار ان کی عمومی خصوصیات کا اظہار ہوت ہے۔ جو اجتماعی صورت میں بلوچ قوم کے افراد میں موجود ہیں۔ حریت و آزادی غیرت و حمیت، خودداری و عزت نفس شجاعت و بہادری بے خوفی و بے باکی، مہمان نوازی ا

خلاص، پاسداری ، قول و رفاقت، ظالم سے عداوت، دوست وبہی خواہونسے امن و آتشی شاعر کہتا ہے ترجمہ: پر امن بستیاں ویران ہیں ۔ خوشی و شادمانی کا راز توشیریں جنگوں میں پناہ ہے۔
بلوچی رزمیہ شاعری حقیقت میں منظور ڈرامے کی طرح ہیں شاعر خیالی اور افسانوی کرداروں کی بجائے زندہ متحرک اورجاندار کرداروں کا اپنا تا ہے۔ شاعر کے ساچنے کا پیمانہ اجتماعی ہے۔ اس کی نگاہ میں بے پناہ وسعت اور گہرائی ہے۔ رمزیہ شاعری میں نسوانی کردار اور مرد کردار بیک وقت سرگرم عمل دکھائی دیتے ہیں۔مثلاً دودا کی رمزیہ داستان میں سپاہیانہ نبرد آزمائیوں کے ساتھ ساتھ نسوانی کرداروں کی بنیاد ی خصوصیات کو بھی اجاگر کیا گیا ہے بی برگ و گراں ناز کی داستان میں مختلف النوع کرداروں کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے جیسے کہ جیتی جاگتی اور متحرک تصاویر نظر کے سامنے سے گزر رہی ہوں۔ اس داستان میں معشوق سے لے کر رقیب کی سیرت پر سیر حاصل تبصرہ ملتا ہے۔ اس داستان میں بی برگ کی شہرت ۔ اس کی تمام خوبیوں اور خامیوں پر تفصیلی اظہار موجود ہے کہ بی برگ انتہائی دلیر ہونے کے باوجود بشری کمزوریوں کا مظاہرہ کرت ہے۔اس میں میر چاکر کا تذکرہ اس طرح کیا ہے کہ اس کی عظمت بہادری اور ذہانت کا تصور خود بخود ابھر کر سامنے آتا ہے۔ بیشتر قدیم نظموں میں رند دلا شاریوں کی معرکہ آرائیاں شہہ مرید للہ گراناز بالاچ گور پگج دودا کے انتقام کی داستانیں ہیں قدیم بلوچ عشقیہ شاعری میں شہد ا دو مہناز للہ و گراناز، دوستین و شیریں بی برگ و گراناز عزت و مہرک حمل و مہ گنج، مست وسمہو، نتھا دیمک، کیا و سدو کی طویل منظوم داستانیں بہت پسند کی جاتی ہیں۔ ملا فاضل کے اشعار کے چند ملاحظہ ہوں ترجمہ:۔ کل میں شکار کی خاطر ایک معطر وادی کی طرف چل نکلا جہاں مجھے سیاہ سفید رنگ کے گورخر اور عقیق رنگ کے پہاڑی بکروں کا شوق لے چلا وہاں سے میں بلدن پہاڑوں کا نظارہ کرتے ہوئے اور سرسبز گھاٹیوں سے ہوتے ہوئے لوٹا اور ہرنوں کے لئے پر ذوق اور بے تاب نگاہوں کو تسکین دیتا رہا۔آج بادل پر بہار قندھار سے اٹھے پھر دلی کی اوپری اور کابل کی دوپہری ہواو ںں نے ان کو باری باری کاندھوں پر لیا۔پھر لاو ںٔ لشکر کی طرح ملبار کی طرف یلغار کیا اور سارے راستے سمندر سے لب ملاتے ہوئے کل شام کو لوٹ کر سبی ڈھاڈر تک گزر گئے اور پھر گلزارٹھٹھہ پہنچ کر وہاں کے پر آب بانوں سے لے دے کی اور بلند ہو کر ہر دل آرام سرزمین پر چمکتے گرجتے برستے گزرے وادیوں اور سطح مرتفع پر کھل کر برس گئے۔ ان موسمی بارشوں کے بعد ہر جگہ سبزہ ہوگا گایوں اور بھیڑوں کے مالکوں کے دل خوشی سے اچھل پڑے اور جو کل بجلی تین بار وقفہ وقفہ کیساتھ موسلا دھار بارش کی علامت میں چمکتی رہی۔ اس نے مجھ سے ایک عزیز ترین دوست کو دل رنج کردیا۔ شدید غیر مستائی برسنے والی بوندوں نے محبوبہ کے چہرے پر نقاب ڈال دیا اور اس کو

کرمانی کناویز(ریشمی قمیض) کے ساتھ بھگو دیا۔ اس کی گردن، تعویز اور زلفوں کو بھگو دیا۔ اس کی گردن، تعویز اور زلفوں کو بھگودیا۔ اس کے خراسانی ہار، صندلی چہرے کانوں کے چمکتے زیور، ہاتھ کے منقش کڑے، پاو ¿ں کے زیور بھگودیئے۔

Q.NO.04

آزادی کی تحریکوں کے آغازسے ہی سندھ کا اہم کردار رہا ہے ۔ اس خطے کے ہندو اور مسلمانوں نے کبھی بھی برطانوی سرکار کی حاکمیت کو قبول نہیں کیااور سندھ کے باسی اپنے لہو سے آزادی کی تحریک کش آبیاری کرتے رہے۔ پاکستان کے قیام میں سندھی اکابرین کی جدوجہد اور قربانیوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔سندھ پر انگریزوں کے قبضے کے خلاف سب سےپہلا مجاہد ہوش محمد شیدی تھا، جس نےبرطانوی فوج کے خلاف لڑتے ہوئے ''مرسوں مرسوں، سندھ نہ ڈیسوں'' کا نعرہ بلند کرتے ہوئےجام شہادت نوش کیاتھا۔ کراچی کی ایمپریس مارکیٹ شہر کی خوب صورتی کی علامت ہے لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ مارکیٹ 1857ء کی جنگ آزادی کے مجاہدوں رام دین پانڈے اور اس کے ساتھیوں کی قبر پر تعمیر کی گئی تھی۔ 1857ء میں کراچی میں مقیم برطانوی فوج کی 21ویں رجمنٹ کے سپاہیوں نے رام دین پانڈے کی قیادت میں ایک منصوبہ تشکیل دیا، جس کے مطابق رات کے وقت اس رجمنٹ کے سپاہیوں نے ملیر کینٹ پر قبضہ کرنے کے بعد انگریز فوجی افسران کو قتل کرکے آزادی کا باقاعدہ اعلان کرنا تھا، لیکنبعض مخبروں نے اس کی اطلاع انگریز افسران کو دے دی جس کے بعد انگریزوں نےرام دین پانڈے اور اس کے ساتھ منصوبے میں شامل 14 باغی سپاہیوں کو گرفتار کرلیا۔13 اور 14 ستمبر 1857ء کی درمیانی شب ان باغیوں کو ایمپریس مارکیٹ کے مقام پر خالی میدان میں لا کرسرِعام پھانسی دی گئی جبکہ رام دین پانڈے سمیت دیگر 3 باغیوں کو توپوں کے مُنہ پر باندھ کر اڑا دیا گیا۔ بعد ازاں ان لاشوں کے ٹکڑے اکٹھے کرکے ایک گڑھے میں پھینک دیے گئے۔ جن باغیوں کو پھانسی دی گئی تھی اُن کی لاشوں کے بھی ٹکڑے کیے گئے اور اسی گڑھے میں پھینک دیا گیا۔ رام دین پانڈے اور اس کے ساتھی، کراچی کے شہریوں کے لیے ہیرو کا درجہ اختیار کرگئے۔ لوگ رات کے وقت آتے، اس میدان میں دیئے اور موم بتیاں روشن کرتے اور پھولوں کے گلدستے رکھ کر چلے جاتے۔ اس صورت حال سے انگریز سرکار کو خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں یہ مقام آزادی کےشہداء کی یادگار نہ بن کر کسی نئی بغاوت کا پیش خیمہ ثابت نہ ہو، اس لیے یہاں ایمپریس مارکیٹ تعمیرکی گئی اورملکہ برطانیہ کی گولڈن جوبلی کے موقع پراس مارکیٹ کو اس سےمنسوب کرکےاس کا نام ''ایمپریس مارکیٹ ''رکھا گیا۔

روپلو کولہی جو سندھ سے منتخب ہونے والی موجودہ سینیٹر کرشناکماری کولہی کے پڑ دادا تھے ، ان کا یوم وفات ہرسال سندھ میں 22اگست کومنایا جاتا ہے۔ 1843ء میں انگریزوں نے سندھپر قبضہ کرلیا تھا لیکن انہیں تھرپارمیں کولہی برادری کی جان بسے سخت مزاحمت کا سامنا تھا،جس کی قیادت روپا جی گوہل یا روپلو کولہی کررہے تھے۔ 15 اپریل 1859ءکو روپلو کولہی نے نگر پارکر کے قریب جنرل ٹائروائٹ کی فوج پرشب خون مارا، جس کے نتیجے میں انگریز فوج کے درجنوں سپاہی مارے جب کہ جنرل وائٹ سمیت زندہ بچنے والے سپاہی فرار ہوگئے۔ جنرل ٹائر وائٹ نے حیدرآباد پہنچتے ہی کولہی باغیوں سے بدلہ لینے کی تیاریاں شروع کردیں، اور وہ جدید اسلحے کے ساتھ نگر پارکر پر حملہ آور ہوا۔ حریت پسندوں نے روایتی ہتھیاروں کی مدد سے کافی دیر تک انگریز فوج کا مقابلہ کیا، لیکن شکست کھائی۔ روپلو کولہی اپنے وفادار ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے فرار ہوکر کارونجھر کی پہاڑیوں میں روپوش ہوگیا۔جنرل ٹائروائٹ نے اس کی تلاش جاری رکھی اور کچھ عرصے کے بعد اسے کارونجھر کی پہاڑی کے پاس ''پگ وول '' کنوئیں پر اس وقت گرفتار کیا گیا جب وہ وہاں رات کے وقت پانی لینے آیا تھا۔روپلو کو گرٹار کرنے کے بعد اسے جنرل ٹائروائٹ کے سامنے پیش کیا۔ جنرل وائٹ کے حکم پرانگریز سپاہیوں نے روپلو پر ظلم و تشددکی انتہا کردی ، اس کی انگلیوں پر روئی لپیٹ کر انہیں تیل میں بھگوکرآگ لگا دی گئی، جس سے اس کی انگلیاں بری طرح جھلس گئیں ،اس سے اس کے ساتھیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اس نےکچھ نہیں بتایا۔ تھک ہار کرجنرل ٹائرنے روپلو کو سزائے موت سنادی۔22،اگست 1859کو اسے سخت فوجی پہرے میں نگر پارکر کے جنوب مشرقی علاقےسوئی گام کے مقام پر لایا گیا اور گردھارو ندی کے کنارے لگے ببول کے درخت کی ڈال پر لٹکا کر پھانسی دے دی گئی۔

شہربھرچونڈی شریف میں مولانا حافظ محمد صدیق کے پاس آئے ۔ عبید اللہ نے مولانا حافظ محمد صدیق اور بھرچونڈی کے باسیوں کی محبت و خلوص سے متاثر ہوکر اپنے نام کے آگے سندھی لگا لیا اور عبیداللہ سندھی کے نام سے پہچانے جانے لگے۔ 1889 میں وہ دیوبند مدرسہ دہلی میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے شاگرد بن گئے جو ایک انقلابی لیڈر تھے۔ کچھ عرصے بعد مولانا عبیداللہ کو مولانا محمود الحسننےہدایت کی کہ وہ ہندوستان میں انگریز حکومت کے خلاف تحریک کا آغازکریں ۔ مولانا عبید اللہ نے اس مقصد کے لیے جمعیت الانصار پارٹی او ر اس کے ساتھ ہی'' نظارت العارف ''کے نام سے دوسری تنظیم 1913 میں دہلی میں قائم کی۔ کچھ عرصے بعدانہوں نے '' جنودل ریانہ '' کے نام سے ایک منظم فورس تشکیل دی ۔ایک دوسرے کو معلومات فراہم کرنے اورکسی بھی خطرے سے بروقت آگاہ کرنے کے لیے ریشمی رومال کو پیغام رسانی کا ذریعہ بنایا،

جس پر ساری معلومات کاڑھ کر بھیجی جاتی تھیں ۔ رومال پر لکھی ہوئی تحریر ایک دوسرے تک پہنچانے کے لیےمخصوص اور قابل اعتماد لوگوں سےکام لیا جاتا تھا۔ان اقدامات کے بعد جمعیت الانصارکی طرف سے فیصلہ کیا گیا کہ ہندوستان سے انگریزوں کونکالنے کے لیے انقلابی جدوجہد کا آغاز کیا جائے جب کہ دوسری جانب افغانستان اور ترکی کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اس انقلابی تحریک کے دوران ہندوستان پر حملہ کردیں جس کے بعد انگریزوں کو ہندوستان سے بھگایا جاسکے۔ مولانا عبیداللہ سندھی اس مشن پر کام کرنے کے لیے افغانستان روانہ ہوئے تاکہ جوپلان بنایا گیا ہے، اس پر عمل درآمد شروع ہوسکے۔مولانا نے افغان حکومت کےسرکردہ افراد سے مذاکرات کے بعد ہندوستان کی آزاد جلاوطن حکومت کے قیام کا اعلان کردیاجس کا صدر راجہ مہندر پرتاب کو بنایا گیا اورخود وزیر اعظم بن گئے۔ مولانا نے مسلمان ممالک کی حمایت سے ہندوستان پر حملے کرنے کے لیے نقشے تیارکروائے اور سندھ میں جہادی مراکز قائم کیے جن کا دائرہ ہندوستا ن تک وسیع ہوگیا۔ اس سلسلے میں تمام ہدایات ایک ریشمی رومال پرکاڑھ کرانہوں نے عبدالخالق نامی شخص کے ہاتھ ہندوستان بھیجیں۔ جب ریشمی رومال پر کاڑھا ہوا پیغام ملتان پہنچا تو خان بہادر رب نواز کی مخبری پر رومال لانے والا شخص پکڑا گیا اور اس پر تحریر کردہ تمام منصوبہ انگریز سرکار پرطشت از بام ہوگیا، جس کے بعد انگریزو ں نے پورے ہندوستان اور سندھ میں کارروائیاں کرکے مولانا عبیداللہ سندھی کے تمام ساتھی گرفتار کرلیے ۔اس ناکامی کے بعد عبیداللہ افغانستان سے روس چلے گئے۔ 1923 میں وہ ترکی گئے جہاں پر ان کا بڑا پرتپاک استقبال کیا گیا، جس کے باعث انہیں کمال اتا ترک کی طرف سے سیاسی اور مالی مدد ملنے کی امید پیدا ہوئی، مگر پہلی عالمی جنگ میں شکست نے ترکی کو کمزورکردیا تھا، اس لیے وہ ان کی کوئی مدد نہیں کرسکا۔کئی سال تک جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے بعد سندھ کے وزیر اعظم اللہ بخش سومرو کی کوششوں سے برطانوی حکومت انہیں سندھ آنے کی اجازت دینے پر راضی ہوگئی جس کے بعد وہ وطن واپس آگئے اور پاکستان کے قیام سے تین سال قبل 1944ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

Q.NO.05

دنیا کی ہر زبان کی طرح بلوچی زبان بھی انسانوں کے بیچ رابطہ و ابلاغ کا ذریعہ ہے۔ہر زبان کی طرح بلوچی بھی اپنی تشکیل آناً فاناً نہیں، بلکہ اپنے ارتقا کے ہزاروں سالوں کے دوران کرسکی ۔(.....اور زبان کی تشکیل کبھی مکمل نہیں ہوتی ---یہ ہمہ وقت جاری ساری رہتی ہے)۔

اسی طرح ہزاروں برسوں کی غلط ودرست کو ششو ں کے بعدیہ زبان تحریری صورت میں سامنے آئی۔تغیر نے سکو ت کوشکست دیتے ہی رہنا ہے ، دنیا میں ثبا ت، اور دوام نامی کوئی چیز وجود نہیں رکھتی۔دیگر ساری زبانوں کی طرح (جی ہاں ساری زبانوں کی طرح)ہماری زبان بھی کسی کے اعلیٰ دماغ میں نہیں اُگی، نہ ہی یہ کسی پنڈت پادری کے ہاتھونآسمان سے نہیں اتری ۔بلکہ ہر زبان اپنے سے پہلی زبانوں کے الفاظ اور فریم میں پیداواری عمل کے دوران بڑھتی اورپھلتی پھولتی رہی۔زبان رواں آب کی طرح ہوتی ہے ، بار بار پیچھے ہٹتی ہوئی ، پیچ وخم کھاتی ہوئی مسلسل آگے ہی بڑھتی جاتی ہے۔

جیسے کہ ذکر ہوا مہر گڑھ کی زبان ابھی دریافت و عدم دریافت کے چلمن کے پیچھے دُھند میں یافتگی کے انتظار میں ہے۔ اس لئے جب تک وہ '' ڈی کوڈ'' نہیں ہوتی،ہم بلوچی زبان کواپنی جڑوں سے اکھڑی ہوئی زبان ہی قرار دے کر اُس پر بات کرنے پر مجبور ہیں۔

بلوچی کے بارے میں ایک بہت ہی دلچسپ بحث چلتی رہی۔ مہر گڑھ، پیرک اور نوشہرو کی دریافت سے قبل ،ہماری ہر بات کو آریاؤں کے قافلے کے آخری اونٹ کی دُم کے ساتھ باندھ دیا جاتا رہا ہے۔اب پتہ نہیں سائنس اِس پوری تھیوری کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے؟۔ کیا شمال سے بڑے پیمانے کی مہاجرتیں ہوئی بھی ہیں؟ ۔ اور کیا آریا لوگ اتنی تعداد میں آئے بھی ہیں؟ ۔مجھے تو آرکیالوجی میں نئی نئی دریافتوں کے تیور اس بارے میں ٹھیک نہیں لگتے اور یہ بات اچھنبے کی نہ ہوگی کہ ایک دن آثارِ قدیمہ کی نئی نئی کھدائیاں اعلان کردیں کہ کوئی مہاجرت ومائیگریشن باہر سے ہوئی ہی نہیں ۔ کیسا لگے گا کہ یہ دریافت ہوجائے کہ مائیگریشنیں کسپیئن اور حلب سے بلوچستان کی طر ف نہیں ہوئیں بلکہ الٹا مہر گڑھ سے شمال اور حلب کو ہوئیں؟ ۔ واللہ اعلم بالصواب!۔

چلو ہم اب تک کے مقبول مفروضے ہی کو مان لیں اور کہیں کہ ہمیں بھی اس بات سے کوئی اختلاف نہیں کہ آریا لوگ آکر ہم میں مدغم ہوئے اور وہ ہم سے اور ہم اُن میں سے بنے۔یہ تھیوری بھی درست مان لیتے ہیں کہ آریاؤں کی زبان ''سنسکرت'' (معنی=تراشیدہ ، شستہ اور صاف کیا ہوا) ہم سب کی زبانوں کی سنگی سہیلی کے بجائے اُن کی دادی قرار دی گئی ۔ لہٰذا یہاں کی ہماری زبانوں کے لئے ''پراکرت'' (خوردو، جنگلی،فطری، ناتراشیدہ) لفظ استعمال کرنے لگے۔ اگر اس طرح ہے بھی تو سوچیے کہ جس طرح بہت قلیل تعداد میں آنے والے آریا اپنے تمام تر ویلیو سسٹم کے ساتھ ہماری بہت بڑی اکثریت سے گھل مل گئے اسی طرح ہماری زبانیں بھی باہم یوں جذب و انجذاب کے عمل میں گئیں کہ اب ایک ہی زبان بن گئی۔ بلوچی میں سنسکرت کے بہت سارے الفاظ موجود ہیں (2)۔ایک لحاظ سے سنسکرت زبان ہم میں سے ہے اور ہم اُس میں سے ہیں..... چنانچہ ہم اس بات پر پہنچتے ہیں

کہ یوں آریا بلوچ بنتے گئے، اور بلوچ آریا کے ضم ہونے کے پراسیس کے نتیجے میں وسعت یافتہ ہوگیا۔ اب ہم ایک ہیں۔

ماہر ینِ لسانیا ت کی کلاسی فی کیش کے مطابق ہماری بلوچی ،زبان ،آریائی زبانوں کے ''انڈو یوروپین'' خاندان انڈو ایرانی شاخ سے ہے ۔ان میں سے جو شاخ'' ایرانی '' کہلاتی ہے ، بلوچی اس میں شامل ہے ۔

ہماری یہ قدیم ایرانی شاخ مزید تین ادوار میں منقسم ہے:۔

سب سے پرانا دور(1000 سال ق م) قدیم ایرانی کہلاتا ہے جس کی اہم زبانیں تھیں: قدیم فارسی،میڈک، اوستا، اور پہلوی۔(3)۔اَوِستا قدیم فارسی کی وہ صورت ہے جو زر تشتیو ں کے مذہبی کتبوں پر کھدی ملتی ہے۔(4)۔

دوسرا دور(331 سال ق م) وسطی ایرانی کہلاتا ہے ۔جس میں پہلوی، سوگدیائی اور بلکی زبانیں تھیں۔

تیسرا دور موجودہ ہے جس میں اہم زبانیں ہیں جدید فارسی، پشتو، کردی، اور بلوچی۔ یہ سب نئی ایرانی زبانیں کہلاتی ہیں۔ (4)۔

مجھے یہاں بس ایک شک کا اظہار کرنا ہے ۔ اگر کبھی مہر گڑھ کی زبان ڈی کوڈ ہوگئی تو بلوچی) زبان کو بعد میں آنے والی آریائی زبان قرار دینے کو دھچکا نہ لگے گا۔ اور اگر آرکیالوجی یہ ثابت کرے کہ کوئی بڑی مائیگریشن شمال سے جنوب کو ہوئی ہی نہیں ،گویا کوئی بڑے پیمانے کی آریائی مائیگریشن بلوچستان میں نہیں ہوئی توکیا، تب بھی بلوچی آریائی زبانوں کے صدر دروازے والے قلعے میں بند رکھی جائے گی؟

آئیے ذرا مختصر ترین انداز میں بلوچی زبان کی علاقائی سا لمیت کے فر یم میں رہتے ہوئے اِس کے ارتقا میں شامل بہت بڑے عوامل و عناصر کا تذکرہ کریں۔

ق۔ م کے قریب مغربی ایران میں ماد حکومت قائم ہوئی۔ اس کا پایہِ تخت موجودہ ہمدان تھا۔ اُس 708 زمانے میں کرد بلوچ'' آھورا'' کی پرستش کرتے تھے۔ ''ھور'' کا مطلب ہے، آگ اور''آ'' کا مطلب ہے :آیا، ..... '' وہ حقیقت جو آگ سے دائمی ہے''۔ یعنی ''آتش پرستی'' کا مذہب۔توران اور مکران کے بلوچوں نے اپنے اس مذہب کو رواج دیا۔ اورتو ران کی بت پرستی نیم دلی اورنیم انداز میں متروک ہوگئی۔ کرد بلوچ دن میں تین بار آگ کی پرستش کرتے تھے۔ وہ اپنی عبادت گاہ کو ''آرینم '' کہتے تھے۔ جس کا مطلب ہے آتشکدہ۔ آتشکدہ کے معبد کو آری وان کہتے ہیں۔ شہروں اور دیہاتوں میںآتشکدہ ہوا کرتے تھے۔ بلوچ آج بھی آگ کی بہت عزت کرتے ہیں۔ ہمارے محاوروں اور ضرب الامثال میں آج بھی آگ کو پھلانگنے ،آگ کی طرف پیر کرنے، آگ کی طرف تھوکنے، آگ کی طرف

ہاتھ کے پنجے سے لعنت بھیجنے کی سختی سے حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ہمارا بچہ بھی غیر ارادی طور پر آگ کی تکریم کرتا ہے۔ آگ کی حرمت کرنے کی خصلت بلوچ میں قرنوں تک جاری رہے گی' اس لئے کہ یہ ہمارے اجداد کا مذہب تھا۔اور اسے ادب کے مانوس و نامانوس اصناف کی ڈھال دستیاب ہے ..... آپ تصور کرسکتے ہیں کہ بت پرستی سے آتش پرستی کی طرف ہمارے ڈھل جانے نے ہماری زبان میں کیا کیا وسعتیں لائی ہوں گی!!۔

پھر اس خطے میں بادشاہ اشوکا نے 260 ق م میں بدھ مذہب اختیار کیا اور راہبانہ لباس پہن لیا ۔ اس نے بدھ مذہب کی تعلیمات کے مطابق شکار اور گوشت خوری سے پرہیز شروع کردیا... وہ ہر ذی روح سے شفقت اور نرمی کے سلوک کی تلقین کرتا تھا۔ اس نے بدھ مت کی تبلیغ و ترویج کی زبردست کوشش کی ۔ وہ انتہائی رواداری برتنے والا انسان تھا ۔ وہ لوگوں کے دماغوں کو جیت کر انہیں اپنے دین میں شامل کرتا تھا ۔ اشوک نے اپنی پوری سلطنت میں ریڈیکل تبدیلیاں کیں ۔ جب وہ شہزادہ تھا اس نے ٹیکسلا میں وائسرائے بن کر بلوچ علاقوں پر حکمرانی کی ۔ بدھ مذہب سے متعلق اس کی تحریریں ستونوں پر کنندہ کی گئیں۔ اس کے بعد موریا خاندان زوال کا شکار ہوگیا۔ بلوچستان سے اس کی علمداری کا خاتمہ ہوگیا۔ ابھی تک بلوچستان کے ادب میں(بالخصوص سنائی جانے والی فوک داستانوں میں)بدھ مت کے اثرات بڑے پیمانے پر ملتے ہیں (5)۔

پھر آئیے ایک اور نظریے کے بلوچی زبان و ادب پر اثرات دیکھیں۔غلام داری سماج کے خلاف ''مانویت ''اور ''مزدکی'' تحریکیں ہمارے پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہیں۔ زرتشتی مذہب ریاستی مذہب کا درجہ پاگیا تھا۔ مگر شاہ پوراول کے دور میں مانی نے خود کو یسوع مسیح کا سب سے بڑا اور آخری حواری جتایا ۔ اس کی تحریک اور مذہب کا نام ''مانویت'' پڑا۔ اس تحریک سے ہمارے اس خطے کے غلام داری سماج میں زبردست بحران آیا ۔ مانویت نے اس سماجی ڈھانچے کو غیر منصفانہ قرار دیا اور اس پر زبردست تنقید کی ۔

یہیں پر مزدک کی قیادت میں ایک اور انقلابی یوٹو پیائی تحریک شروع ہوئی ۔ مزدکیوں نے سماجی برائیوں کے خلاف کھلے عام جدوجہد کرنے کا اعلان کیا ۔ ان کا مطالبہ تھا کہ فاضل جائیداد رئیسوں سے چھین لی جائے ۔ مزدک کی نظرمیں حرص اور استحصال نے ''انسانیت کی برابری '' والے خدائی حکم اور خدائی خواہش کو تباہ کر دیا تھا ۔ مزدک نے خدا کی اس خواہش اور حکم کی دوبارہ بحالی کو اپنا مقصد حیات بنا دیا (6)۔

چونکہ زرتشتی پادریوں اور وڈیروں کی طاقت بہت بڑھ چکی تھی اور بادشاہ ان کی اس طاقت کو کمزور کرنا چاہتا تھااس لئے شاہ قباد نے اس نئے انقلابی مزدکی نظریے کی حمایت کی۔ اس نے

مزدک کی تعلیمات کے مطابق معاشی سماجی اصلاحات کیں ۔ جس سے وڈیرے اور زرتشی ملاّ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور قباد کو عارضی طور پہ اپنے بھائی جما سپ کے حق میں معزول ہونا پڑا ۔ مگر فوراً ہی اس نے پینترا بدل ڈالا اور دوبارہ اپنا پرانا مذہب اختیار کیا اور دوبارہ حکمران بنا ۔ اب کے اس نے مزدکیوں ہی کا قتل عام شروع کیا ۔

اس قتلِ عام کی قیادت اس کے شہزادے خسرو اول نے کی جسے پھرا نوشیروان کا خطاب ملا (انوشک۔ روبان۔''لافانی روح والا)۔مزدک کو انوشیرواں نے 528 کے اواخر میں اُس وقت بے دردی کی موت دے دی جب ساسانی حاکمیت عروج پر تھی (7)۔

مگر ظاہر ہے اتنے بڑے نظریے کو ایک ہی دن میں تو ختم نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ چنانچہ جب ضیاء الحقی خصوصیات والا انوشیروان 531 میں خود بادشاہ بنا تو اس نے مزدکیوں کے قتل عام کا ایک اور دور چلایا ۔ کہتے ہیں کہ اس چنگیز کے ہاتھوں ہزاروں مزدکی مارے گئے ۔ بلاشبہ مزدک کی انقلابی تحریک ہمارے خطے کی تاریخ میں سب سے بڑی طبقاتی تحریک تھی ۔

بلوچوں کی اکثریت بہت زمانے تک '' مزد کیت'' سے وابستہ تھی۔آج بھی بہت سے بلوچوں کا نام مزدک ہے۔آج بھی انوشیروان بلوچ کی نفر ت کا مرکزہے۔کتنے نئے الفاظ ایجاد ہوئے ہوں گے بلوچی میں اور کیا کیا ضرب الامثال، مناجات اور دعائیں اپنا رس اِس بہتی میٹھی نہر میں گھولتی رہی ہوں گی!۔

پھر اسلام پر امن طور پر بلوچستان آیا، عرب حملوں سے بہت پہلے،عرب تو بعد میں بہت عرصہ کے بعد ، بلوچ سے تجارت و دوستی و پناہ گیری کرتے کرتے باقاعدہ حملہ آور اور پھر قابض ہوگئے۔عربوں کے ڈائریکٹ یا بالواسطہ روابط نے بے شمار الفاظ ہم سے شیئر کرلیے۔ سردار خان گشکوری نے مشترک الفاظ کی ایک طویل لسٹ مہیا کردی : شان، اصل، منزل، مجلس، کلام، نصیب، امیر ، تاج ، کیف ، مروارد، غم، حنی، قبہ، خلق، طام ، قوت ، ضرت ، قدر ، جہد ، وسواس ، سر، ظلم ، اسرار، ایمان، حد ، جان، بقا، شک، والی، وارث، بر، دکان، وکیل ، شہم، بہوش ، مسکین، لولاک، گراغ، سترا، ملوک، وبا، شاہد..... وغیرہ وغیرہ ۔ اور یہ الفاظ ایک آدھ صدی پرانے نہیں بلکہ پانچ سو برس قبل سے ہم میں موجود مستعمل ہیں(8)۔

گیارھویں صد ی میں تر کمنوں کے قبیلے سلجو قوں کے طغر ل بیگ کی سطنت پارس پہ چھا ئی ہوئی تھی ۔ بے شمار ترک قبا ئل پارس کو مہا جر ت کرگئے جہاں وہ بلو چوں کے ساتھ کر مان ،خراسان ، سیستان اور ہر ات میں رہنے لگے۔ ہماری قبائلی ساخت انہی کے الفا ظ استعمال کرنے لگی ۔ او لس (قوم) ، تمن ، بولک ، تمند ار ، لاغ ، اولاک ،ادّا (بھا ئی) ، اُرد ، (9) ہم مشترک طور پر استعمال

کرتے ہیں۔

غوریوں کے بعد نصیر الدین قباچہ قابض ہوگیا۔ جس کے بعد بلوچستان ان علاقوں میں سے ایک بنا جو شمس الدین التمش کے مقبوضہ جات تھے۔ یہ بات1225 کی ہے۔اور یہی دور بلوچستان کی بُلبل شاعرہ حضرت رابعہ خضداری کا ہے۔ عشقیہ داستان تشکیل دینے والی رابعہ' ہمارے ہاں ایک ولی کادرجہ رکھتی ہے۔ ایک خوبصورت شاعری کو جنم دینے والی رابعہ خضداری' بلوچستان کی ثقافتی تاریخ میں ایک بہت ہی بلند چوٹی تصور ہوتی ہیں۔

سولہویں صدی کے شروع میں پرتگیزیوں نے بلوچ وطن کا بھی رخ کیا اور بلوچستان کے ساحلی علاقوں پر ''امن،سلامتی،تمدن،جمہوریت اور پرامن بقائے باہمی'' پھیلانے کے لئے حملے کیے۔مہذب مغرب کے پرتگالیوں کے ساتھ بلوچوں کی زبردست مزاحمتی جنگ ہوئی جس کے آثار ہماری زبردست شاعری میں آج بھی موجود ہیں۔کیا خوبصورت شاعری ہے وہ،ہمل والی !!.....اورپھر بلوچی زبان کے خزانے میں الماری ، صابن ، تو لیہ وغیر ہ جیسے الفاظ اور تصورات وہیں مغر ب سے تو آئے!!۔

پندرہویں سولہویں صدی '' رِندی'' عہد کہلاتا ہے۔ یہ عہد بلوچی زبان و ادب کا ترقی یافتہ ترین دور ہے ۔اور اس میں زبردست شاعری تخلیق ہوئی ہے ۔ جہاں عشق و محبت کی داستانیں وافر ہیں، جہاں قبائلی جنگوں پر مبنی شاعری موجود ہے اور جہاں بیرونی حملہ آوروں اور اُن کے خلاف مزاحمت کے خوبصورت شاہکار شاعری کے خزانے پڑے ہیں۔

چاکر کے عہد میں بلوچی زبان ایک بالغ زبان تھی اور دنیا کی دیگر بڑی زبانوں کے ہم پلہ ادبی ، ثقافتی اور سائنسی اظہاربھرپور انداز میں کررہی تھی۔ سچ ہے کہ دوسری کسی بھی زبان کی طرح، بلوچی زبان بھی بنی بنائی شکل میں چاکرو شہیہ مریڈ کو نہیں ملی بلکہ وہ تو صدیوں کی'' تجرباتی کوششوں سے پیدا ہونے والی نطقی روایت کے نسل درنسل منتقل اور متغیر ہوتے رہنے کا نتیجہ ہے۔ تغیر و تبدل اور تراش خراش کے اس کے دامن میں 'صوتی آنکھ مچولی ہی نہیں بلکہ تہذیبی سفر، نفسیاتی کرشمہ اور سیاسی و سماجی نیرنگیوں کی داستان بھی موجود ہے۔

اس قدر قدیم زبان کا خالص اور سُچا رہنا نہ کل ممکن تھا اور نہ آج ممکن ہے ۔چاکری عہد کی بلوچی بھلا زرتشتیوں کے جشنِ نوروز ، اور اس سے متعلق اصطلاحات، اور شعر و ادب سے بچ سکتی تھی؟۔ وہ بلوچی جو خود خیر سے کافی عرصے تک زرتشتی رہی تھی۔

پندرہویں صدی سے لے کر اٹھارویں صدی تک بلوچستان خوانینِ قلات کی حکمرانی میں رہا۔ جہاں فارسی دفتری سرکاری زبان رہی۔ بلوچی زبان پیچھے بھی بہت گئی مگر جدید فارسی اثرات نے غیر

سرکاری بلوچی کو امیر بھی کردیا۔(غیر سرکاری بلوچی زندہ باد!)۔

نصیر خان نوری کی دہلی تک فوج کشیوں نے دیگربہت سی بلوچستانی وغیر بلوچستانی زبانوں کے ساتھ بلوچی زبان کے روابط قائم کروادیے۔ وہاں سے غلام لائے گئے، عورتیں باہر سے یہاں لا کر اپنے فوجیوں میں بیاہ دی گئیں۔ تجارت کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔

چھوڑیے حاکموں کی فتوحات پر ہم نہیں اتر اتے !ہمیں تو بس قدرت نے جام درک عطا کرنا تھا، کردیا۔

انیسویں صدی کے اواخر میں قسمت نے بلوچی زبان کی ایک اور زبان ،انگلش کے ساتھ لین دین کرانی تھی جو آج تک جاری ہے۔ انگریز پہلے توطبعی طور پر ہمارا سامراج بنا جب ہم نے لڑ لڑ کر اس کا حلیہ بگاڑ دیا ۔انگریز سے اِس دشمنی کے رابطے سے ہماری زبانوں کے الفاظ نے بے شمار لین دین کی۔ انگریز نے ہماری نفسیات و سماج کوسمجھنے کے لیے ہماری زبان سیکھی، اُس کے بارے میں لکھا ، تحقیق کی۔ اس نے ہماری کلاسیکی شاعری جمع کرکے چھاپی۔ گرامر، فوک کہانیاں اور موسیقی کو جمع کیا اور انہیں تحریر کرکے ابدمان کردیا ۔ ہم اُن سارے سکالرز اور ریسرچرز کے احسان مند ہیں۔ ہماری زبان ہزار گنا ترقی کر گئی ۔ صرف اسّی سال بعد بلوچ آزاد تو ہوا مگر اُس وقت بن گئی۔کتنے الفاظ Lingua franca تک انگلش زبان دنیا بھر میں سائنس ٹیکنالوجی اور تجارت کی اس نے ہم سے، ہم نے اس سے لیے!!۔ ٹوک ، ڈوڈو،ٹال،.....

اُس بیچ پہلی جنگ عظیم بھی آئی۔اُس میں جرمن پمفلٹ خراسان و خضدار کو سیراب کرتے رہے۔ نئی نئی باتیں ، نئے نئے الفا*.....

اور یہیں کہیں 1917 میں روس میں بالشویک انقلاب ہوا۔ لینن، سوشلزم، بورژوازی، پرولتاری، قومی آزادی الغرض بہت بڑے فلسفیانہ سوال اپنی مخصوص اصطلاحات کے لشکر کے ساتھ بلوچی زبان کے وسیع دامن میں پناہ گزین ہوئے اور بالآخر مقامی بنے۔

ابھی، دوڈھائی سو برس قبل کی ہماری اپنی سامراج دشمن جنگ نے ہمیں انڈین نیشنل کانگریس سے ملوادیا اور درجنوں زبانوں کے ساتھ بلوچی کو بغلگیر کرایا ۔ اور پھر دوسری عالمی جنگ اور اس کے نتیجے میں بلوچستان کی اپنی آزادی کے ساتھ ساتھ درجنوں ملکوں کی سامراج سے آزادی کی پرمسرت ہوائیں چلیں۔ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ بلوچی زبان نے ترقی کے کتنے زینے پھلانڈلیے۔

اُس کے بعد پھر ہم سرد جنگ کا حصہ بنا دیے گئے۔ مگریہاں افغان انقلاب نے جتنا مثبت اثر ہم پر ڈالا شاید ہی کسی اور واقعہ نے بلوچی زبانوں کو اس قدر مالا مال کیا ہو۔

بیسویں اکیسویں صدی حیرتوں کی صدیاں رہی ہیں۔وہ وہ واقعات و ایجادات ہوئے کہ بلوچی زبان کے

بشمول پوری دنیا کی زبانوں میں بگ بینگ بجنے کا تسلسل رہا ہے۔ مثلاً آپ دیگر لوگوں اور زبانوں کے ساتھ بلوچی زبان کے ملنے جلنے میں تیز رفتاری کا اندازہ کریں۔ اسی صدی میں انگریز آیا، صرف خود نہ آیا بلکہ وہ تو بہت سی بولیاں بولنے والوں کے ذریعے ہم پر حملہ آورہوا۔ ہماری زبان تو خیر پہلے ہی ہماری دفتری زبان نہ تھی مگر انگریز نے فارسی کو دھکے مار مار کر تخت سے گرادیا اور انگلش، اردو کو دفتری سرکاری زبان بنا ڈالا۔پھر انگریز کے ذرائع آمدورفت دیکھیے، شتر بانی سے ہمیں ہٹا کر بڑے پیمانے پر ریلوے کے ذریعے ہمارا تعلق ایک سے زیادہ زبانوں سے کروادیا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے یہاں بے شمار پیشوں کو ختم کردیا، اُن پیشوں سے متعلق الفاظ و استعارات اکھاڑ پھینکے ۔ اور نئی ٹکنالوجی کے سارے الفاظ، اشارے، مخفف بلوچی میں رائج کردیے۔ اب آٹو موبیل، سپیس ٹکنالوجی ، الیکٹرانکس، انٹرنیٹ اور موبائل فون نے ہماری دنیا بدل کے رکھ دی ۔ بلوچی زبان اس قدر تیز رفتاری سے ترقی کرتی، اور امیر ہوتی جارہی ہے کہ :

محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی

اللہ کا لاکھ لاکھ شکرادا کیجیے کہ بلوچی زبان حادثاتی طور پر بنی ہوئی زبان نہیں ہے ۔ اس بات پر بھی کہ یہ ایک تہذیبی اور ثقافتی پس منظر رکھنے والی ، ارتقائی عمل سے گزر کر قومی زبان اور شناخت کی علامت بن جانے والی زبان ہے۔

اِس میں جاری ارتقا اور بڑے پیمانے کے لین دین کی حوصلہ افزائی ہی کرنی چاہیے۔